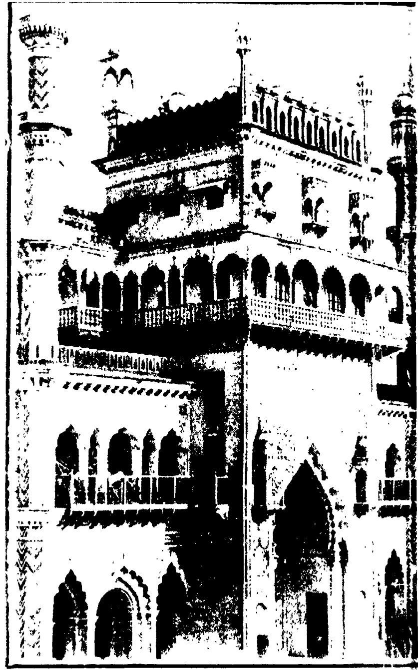
بشیر پاشا سیریز



تذکرہ

نواب محسن الملک مرحوم

مرتبہ

محمد امین زبیری

ائی اسکول (اٹاوہ)

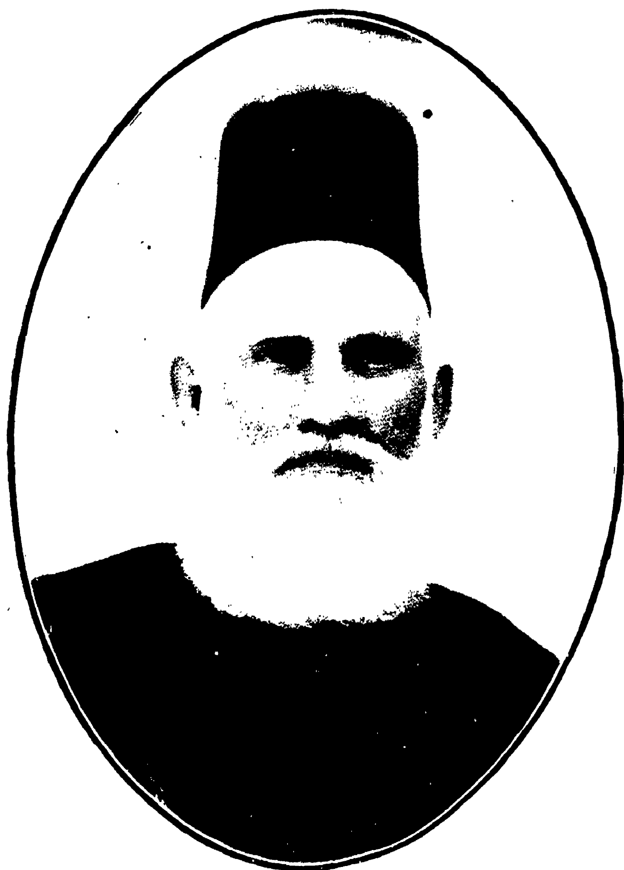
Title and inside Blocks printed by Taj Printing W

بلیٰ من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف
عليهم ولا هم يحزنون ۝

محسن الملک

باہتمام محمد احیدالدین ایف آر ایس اے (لندن)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ



صفحہ

معنون

میں اس سلسلہ کو اپنے شاگرد رشید جواں مرگ بشیر پاشا مرحوم
بی اے بی ٹی کے نام سے معنون کرتا ہوں جس کی زندگی اور جس کی
تعلیم و تربیت کا مقصد قوم کی تعلیمی خدمت تھی اور جس نے تکمیلِ تعلیم کر کے
اپنی زندگی کو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

محمد الطاف حسین

تذکرۃ المشاہیر

نوجوانانِ قوم میں ملک اور قوم کی خدمتوں کا جذبہ پیدا کرنے اور ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے اُن مشاہیرِ قوم کی سوانح عمریوں کا مطالعہ جنھوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی ترقیوں میں جانفشانیاں کی ہیں نہایت موثر ذریعہ ہی اور ہر ملک اور ہر قوم میں اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہی۔ اعظم الرّجال کی بڑی بڑی سوانح عمریوں کے علاوہ خوشنما سائز اور عمدہ طباعت کے ساتھ کم قیمت لائف اسکیچ بہ کثرت شائع کئے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان میں مسلمانوں نے اس ذریعہ پر کچھ توجہ نہیں کی حالانکہ دوسری قومیں اسی ذریعہ سے بہت کچھ منافع حاصل کر رہی ہیں۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں نے اور مولوی بشیر الدین صاحب منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ نے ارادہ کیا ہی کہ جہاں تک ممکن ہو اس عصر جدید میں جن مشاہیر نے اپنی عمریں قومی خدمت اور قومی ہمدردی میں صرف کی ہیں اُن کے لائف اسکیچ شائع کئے جائیں۔

چنانچہ اس وقت اس سلسلہ کے چند نمبر شائع کئے جاتے ہیں اور میں اُن عزیزوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری دلی خواہش کی تکمیل میں اپنا وقت صرف کر کے اور محنت اٹھا کر ان تذکروں کو مرتب کیا ہے خداوند تعالےٰ ان کو جزائے خیر دے اور ہم کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے

میں اپنے پُرجوش نوجوان دوست سید عبدالجلیل صاحب کا جو بمبئی میں فن طباعت کی تکمیل کر رہے ہیں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہایت تنگ وقت میں تصاویر کے ایسے اچھے اور عمدہ بلاک خود تیار کر کے بطور امداد عنایت کئے اور اپنی نگرانی میں ان کو طبع کرایا۔

میں اپنے اہل قلم نوجوانانِ قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قومی خدمت میں ہماری مدد کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔

اس سلسلہ کی اشاعت سے اگر کچھ فائدہ ہوا تو اسی سلسلہ کی توسیع میں صرف ہوگا۔

محمد الطاف حسین بی اے

ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سیّد مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر



(۱)

نواب صاحب اٹاوہ کے ایک معزز خاندان سادات سے تھے جو مشہور سادات بارہہ کے خاندان کی ایک شاخ ہے۔

وہ ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے جو سنہ کہ ملکہ وکٹوریہ کے تخت انگلستان پر جلوس فرمانے کے سبب سے تاریخ عالم میں قابل یادگار رہے۔

اگرچہ نواب صاحب کے والدین کو دولت و ثروت سے کوئی حصہ نہ ملا تھا لیکن خاندانی شرافت کا جوہر اس خاندان کا قیمتی ورثہ تھا۔

نواب صاحب کی ابتدائی تعلیم اُس زمانہ کے دستور کے مطابق خانگی مکتب میں شروع کی گئی۔ علی العموم ایسے مکاتب میں حرف شناسی کے بعد ہی فارسی کی ابتدائی کتابیں شروع کرادی جاتی تھیں۔ ذہین اور ہونہار طالب علم ان ابتدائی مراحل کو طے کرنے کے بعد علماء و فضلاء کے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے تھے۔ جو یونیورسٹی تعلیم کے مماثل تھا۔

نواب صاحب نے اُن تمام منازلِ تعلیم کو چند سال ہی میں انتہائی جامعیت اور ذہانت و ذکاوت کے ساتھ طے کیا۔ اُن کے اساتذہ میں جن سے انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی مولوی عنایت حسین صاحب ساکن دیبہ (جنھوں نے قصبہ پھپوند میں سکونت اختیار کرلی تھی) خاص طور پر قابل الذکر ہیں۔ وہ علوم مشرقی کے عالم متبحر اور بالخصوص دینیات کے عالم اجل تھے۔

چونکہ اس زمانہ میں انگریزی تعلیم کے نہ تو ذرائع مہیا تھے نہ وہ شرط ملازمت تھی اور نہ ان صوبوں میں رواج تھا اس لئے نواب صاحب کو اس کا خیال بھی نہ گزرا ہوگا اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ وہ اس تعلیم سے بے بہرہ تھے۔

(۲)

مشرقی تعلیم کے مدارج طے کرنے کے بعد وہ خانگی حالات کے اقتضاء سے یا اس خیال سے کہ سرکاری ملازمت ذریعہ اعزاز و افتخار ہے ملازمت کے خواہاں ہوئے اور دس روپیہ ماہوار کی ایک جگہہ اُن کو اٹاوہ کی کلکٹری میں مل گئی۔

چند سال بعد اُن کی قابلیت و محنت کا یہ صلا ملا کہ مسٹر ایلن ہیوم کلکٹر اٹاوہ نے محر

سے اہلمد کر دیا۔ پھر عہدۂ پیشکاری حاصل ہوا۔ اور ڈیڑھ سال بعد سررشتہ دار اور ۲ دو سال بعد ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار کر دیئے گئے۔

زمانہ تحصیلداری میں انتظامی اور دفتری قابلیت کا وہ جوہر جو محرری میں ہی چمکنا شروع ہوا تھا اب پورے طور پر درخشاں و تاباں ہوا۔ اُنھوں نے اُس عہدہ پر نہ صرف انتظامی قابلیتوں کو نمایاں کیا بلکہ قانونی قابلیتوں کے جوہر بھی چمکائے اور صیغہ مال و فوجداری کے متعلق نہایت اعلیٰ درجے کے رسالے بزبان اُردو تالیف کئے جو عامۃً اُس زمانے کے حکّام کے لئے قانونی رہبری میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔ اُن کی انتظامی قابلیت کے آثار میں بہت سی سرکاری عمارتیں سڑکیں اور ہیوم گنج آج تک موجود ہیں۔

اُنھوں نے ۱۸۶۳ء میں اعلیٰ نمبروں کے ساتھ امتحان پاس کیا اور سب میں اوّل آئے اور ۱۸۶۶ء میں وہ مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو گئے۔ جہاں اُن کو دو تعلقوں کے کورٹ آف وارڈس کی منیجری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ اُنھوں نے ان تعہدات کو ایسے قابل تعریف طریقہ سے انجام دیا کہ مسٹر ٹالپک کلکٹر ضلع نے اپنی سالانہ رپورٹ میں اُن کے متعلق یہ ریمارک کیا کہ "میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حدی عملی سے زیادہ مستعد ایماندار کوئی ملازم صوبہ ممالک مغربی و شمالی میں نہیں ہے۔"

اُنھوں نے قحط کے کاموں میں بھی قحط زدوں کی دستگیری و ہمدردی میں خلیل حصہ لیا جس کا گورنمنٹ اور پبلک نے شکرگزاری کے ساتھ اعتراف کیا اور ۱۸۶۹ء میں

کمشنر الہ آباد کی سفارش پر اُن کو بصلہ حسن خدمات گورنمنٹ سے خلعت عطا ہوا۔

(۳)

قدرت نے مہدی علی کی ذات میں جن قابلیتوں اور جوہروں کو ودیعت کیا تھا اُن کے لئے ڈپٹی کلکٹری یا کسی پرگنہ کی حکومت کا میدان نہایت محدود اور تنگ تھا اور خدا کو منظور تھا کہ وہ ایک وسیع ملک کی اصلاحات میں اپنی قابلیتوں اور جوہروں کو نمایاں کریں۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں وہ اپنے اُس عہدہ سے مستعفی ہو کر دولت آصف جاہی کی سلک ملازمت میں داخل ہوئے یہ وہ زمانہ تھا کہ سر سالار جنگ اوّل شمالی ہند کے قابل اصحاب کی خدمات سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ اُن کے دل پر سر سید کا ایک خاص اثر تھا اور اسی باعث اُنھوں نے سر سید کو اس انتخاب میں شامل کیا۔

سر سید نے نواب صاحب کی سفارش کی اور وہ مجوزہ کارروائی کے عہدہ پر بمشاہرہ آٹھ سو روپیہ ماہوار (ایک ہزار حالی) مقرر ہوئے۔

ابتدا میں دفاتر محاسبی کی تنظیم کے علاوہ ان کا زیادہ وقت ملک کی مالی حالت دریافت کرنے میں صرف ہوا۔ دو سال بعد وہ ریونیو سکرٹری کے ممتاز عہدہ پر مامور کئے گئے اور سروے اور بندوبست کا چارج بھی بحیثیت اعلیٰ افسر کے اُن کو تفویض کیا گیا۔

سروے اور بندوبست کی خدمات کو اُنھوں نے اضلاع مرہٹواڑی میں نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا، ملک کی آمدنی کو جائز اور منصفانہ شرح مال گزاری قایم

کر کے محفوظ کیا۔ رعایا کو بہت سے حقوق دلائے اور اُن کو ترقیِ زراعت کی جانب پورا مائل کر دیا۔

اس انتظام مال گزاری اور بندوبست میں اُنھوں نے اس قدر سخت جانفشانی کی کہ باوجودیکہ ان کی عمر چالیس ہی سال کی تھی اور ابتدا سے محنت کے عادی تھے اور مستعدی ان کا خمیر فطرت تھا، مگر صحت پر بُرا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ مخالف پارٹی کی جانب سے جو سر سالار جنگ اور اُن کے آوردوں کے بدنام اور ناکام کرنے میں سرگرم تھی، اعتراضات کی اس قدر بوچھاڑ ہوئی کہ خود سالار جنگ کو بھی بندوبست کی ناکامیابی کا خیال پیدا ہو گیا۔ مگر نواب صاحب نے حوصلہ مندی کے ساتھ ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔ اعتراضات کو رفع کر کے تمام مشکلات پر قابو حاصل کر لیا اور بالآخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔

نواب صاحب نے سروے اور بندوبست کی ایک مبسوط رپورٹ بھی تیار کی اور اُس کو طبع کرا کے اپنے چند احباب اور برٹش حکام کے پاس جنھیں اس نظم و نسق ملکی سے دلچسپی تھی ارسال کیا۔

سر ولیم میور نے (جو ممالک شمالی و مغربی میں ایک عرصہ تک لفٹنٹ گورنر رہ چکے تھے اور اُس وقت انڈیا آفس میں ممبر تھے) نواب صاحب کو لکھا کہ:۔

جب میں نے آپ کے تبادلۂ حیدرآباد کی خبر سُنی تھی تو اُسی وقت آپ کی ذہانت اور قابلیت کا جو تجربہ تھا اُس کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ اپنی ہر

میں ممتاز ہوں گے"

سر اسٹوارٹ بیلی لفٹنٹ گورنر بنگال نے جن کو رزیڈنٹ کی حیثیت سے حیدرآباد کے شعبۂ مالگزاری کی دقتوں اور خرابیوں کا پورا تجربہ تھا لکھا کہ :-

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ نے نہایت مفید کام شروع کیا اور نہایت کامیابی سے چلایا - بلاشبہ یہ کامیاب حکومت کے لئے سنگ بنیاد ہے آپ کو یہ سن کر اطمینان ہوگا کہ اس لحاظ سے حیدرآباد صوبہ بنگال کے اُن اضلاع سے جن میں دوامی بندوبست ہے بہتر ہے"

لارڈ ڈفرن گورنر جنرل باجلاس کونسل نے خاص طور پر تعریف کی اور اس کی اطلاع رزیڈنٹ کے ذریعہ سے دی گئی -

انتظام مالگزاری کے لئے ان کو نہایت سخت محنت کرنی پڑی اُس کے اصول اور مبادیات تک قایم کرنا پڑے اور جو انتظامی گشتیاں (سرکلر) انھوں نے جاری کیں اور اُن پر عمل کرنے کی جس طرح نگرانی کی وہ ان کی قابلیت کا حیرت انگیز اور عدیم المثال نمونہ ہے اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج دولت آصفیہ کا ترقی یافتہ نظام مالگزاری انھیں کے وضع کردہ بنیادی اصول پر قایم ہے - اس اہم صیغہ کے علاوہ اس کے دفاتر متعلقہ اور عام دفاتر کی اصلاح اور تہذیب ایک دوسرا نمونہ اُن کی بے نظیر لیاقت اور تنظیمی قوت کا ہے -

ان تدابیر و اصلاحات ترقی ملک کے علاوہ نواب صاحب کا ایک اور عظیم الشان

کارنامہ بھی ہے جس میں انسانی ہمدردی اپنے پورے خط و خال کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے اور وہ ۱۸۷۶ء کے قحط کا انتظام ہے یہ قحط ایک سخت بلا کی صورت میں حیدرآباد پر نازل ہوا تھا۔ سر سالار جنگ نے نواب صاحب کی نہ صرف قابلیتوں سے بلکہ اُس نیکی اور فیاضی سے جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے اُن کے دل میں موجود تھی۔ فوراً فائدہ اُٹھایا اور قحط کی سختی دور کرنے کے تمام و کمال انتظامات اُن کے سپرد کر دیے۔

نواب صاحب نے اس فرض یا خدمت کو ایسے ہمدردانہ اور کامیاب طریقے سے انجام دیا اور ایسی موثر تدابیر اور فیاضانہ اصول سے قحط کی سختی کا مقابلہ کیا کہ ہر طرف سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی۔

سر رچرڈ ٹیمپل نے گورنمنٹ کے نمایندہ کی حیثیت سے جب ان انتظامات کا معائنہ کیا ہے تو اُنھوں نے نواب صاحب کے اس انتظام کی خاص طور پر تعریف کی جو گورنمنٹ کے غیر معمولی گزٹ میں شائع ہوئی۔

اس کے بعد کمیشن انسداد قحط میں ایسی اعلیٰ شہادت دی اور کمیشن کو سوالات کے جوابات ایسی جامعیت اور قابلیت سے دئے کہ اُن پر سر چارلس ایلیٹ پریسیڈنٹ نے اپنی رپورٹ میں تعریفی ریمارک کے ساتھ بحث کی۔

نواب صاحب نے قحط اور انتظامات قحط کے متعلق ایک رپورٹ بھی تیار کی تھی جو بہ کثرت شائع کی گئی اور ایک عرصہ تک اخبارات میں اس پر بحثیں ہوتی رہیں ہندوستان کے اخبارات پانیر، دہلی گزٹ، ٹائمز آف انڈیا، ایڈوکیٹ وغیرہ نے اُس پر

لیڈنگ آرٹیکل لکھے۔ پانیر نے اپنے مضمون میں ایک خاص پیراگراف لکھا تھا کہ :-

"ایک دیسی حاکم کے لئے جو حقیقتاً قابل ہو' علاقہ نظام میدانِ عمل اور میدانِ ترقی ہے۔ ان میں مثالاً سید مہدی علی ہیں جنہوں نے اس صوبہ میں ۲۰ سال کی ملازمت میں اپنے آپ کو محض بندوبست میں ڈپٹی کلکٹری (جنوبی مرزاپور میں) کے قابل پایا۔ وہ دکن میں اترے اور انھوں نے کامیابی حاصل کی۔ حکومت حیدرآباد کے ریونیو سکرٹری ہو کر ایسی رپورٹ شائع کی ہے جو شاید محکمہ وضع قانون کے رشک کو بھڑکائے گی"۔

(پانیر ۹۔ فروری ۱۸۸۰ء)

سر سالار جنگ اوّل کی رحلت کے بعد حسب اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس کے حکم سے سر سالار جنگ اوّل کے نوجوان فرزند میر لائق علی خاں عماد السلطنت سالار جنگ ثانی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز کیے گئے تو نواب صاحب فنانشل اور پولٹیکل سکرٹری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ اور اُن کے اقتدار و اثر اور منصب و جاہ میں اور اضافہ ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب اور منصب دو نیم ہزاری ذات اور پانچ سو سوار مع نشان کے عطا ہوا۔ وہ بہت سی اصلاحات جو سر سالار جنگ اوّل کے وقت میں تجویز کر لی گئی تھیں جاری کی گئیں۔ جن کو نواب صاحب کی قابلیت مظہرِ کامل کہہ سکتے ہیں۔

تقریباً چار سال کے بعد عماد السلطنت نے استعفا پیش کیا اور نواب سر آسمان جاہ وزیر اعظم کئے گئے۔

ان دونوں نامور باپ اور بیٹے پر نواب صاحب کی وفادارانہ خدمات قابلیت کا جو اثر تھا اس کا اندازہ عماد السلطنت کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے نواب صاحب کو ایک موقع پر لکھا تھا جس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"آپ نے جو خدمات میرے والد مرحوم کے زمانۂ وزارت میں انجام دی ہیں اور جو امداد اُن کو آپ سے ملی ہو اس کا اندازہ اور قدر تو صرف وہی کر سکتے تھے وہ آپ کو اپنا صادق دوست اور سچا بہی خواہ تصوّر کرتے تھے اُن کو آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے آپ کا ذکر وصیت نامہ میں بھی خاص طور پر کیا ہو۔ میرے زمانہ وزارت میں بھی آپ نے مجھے ایسی بیش بہا امداد دی ہو جس کی میں کسی عزیز قریب سے بھی توقع نہیں رکھتا ہوں۔ میں آپ کی اس مخلصانہ امداد پر شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہونگا۔ اور آپ کی خدمات کا نقش میرے دل سے محو نہیں ہوگا۔

سر آسمان جاہ نے بھی نواب صاحب پر پورا اعتماد قایم رکھا اور وہ بدستور اپنے عہدوں کے فرائض انجام دیتے رہے۔

اب اعلیٰ حضرت نے اُن کو محسن الدولہ محسن الملک کا عالی قدر خطاب مرحمت فرمایا

اور اُن کا نام ہمیشہ کے لئے اس خطاب کی روشنی میں چھپ گیا۔

اس زمانہ میں اُن کو سلطنت کا ایک نہایت نازک اور اہم کام سرانجام دینا پڑا یعنی مملکت نظام کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے ذریعہ اور امداد سے انگلستان کی ایک چالاک جماعت نے (جس میں چند بلند طبقے کے اشخاص بھی شامل تھے) ایک کمپنی کی تشکیل کر کے مملکت نظام کی معدنیات کا ٹھیکہ ایسی شرائط و معاہدہ پر حاصل کر لیا تھا جو بد دیانتی اور چالاکی پر مبنی تھیں اور عہدہ دار مذکور کو بطور حق المحنت یا رشوت کے اس میں کافی حصہ ملا تھا۔ اور رزیڈنسی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے ان شرائط و معاہدہ کی کسی قدر ترمیم کے ساتھ تصدیق بھی کر دی تھی۔ نواب صاحب نے ان تمام چالاکیوں اور بد دیانتیوں کا انکشاف کیا۔ وہ عہدہ دار اپنے عہدہ سے معزول کئے گئے اور اس انکشاف سے انگلستان میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ پارلیمنٹ میں سوالات کئے گئے اور بالآخر اس کی تحقیقات کے لئے ایک پارلیمنٹری کمیٹی کا انعقاد ہوا۔

گورنمنٹ نظام کی طرف سے نواب صاحب مع چند مشیران قانونی پیروی کے لئے بھیجے گئے اور اس سلسلہ میں کئی مہینے لندن میں قیام کرنا پڑا۔ انھوں نے اس پیچیدہ مسئلہ میں اپنی گورنمنٹ کے وقار اور مفاد اور گورنمنٹ آف انڈیا کی پوزیشن کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت ایمان داری اور راست بازی کے ساتھ تمام معاملات کو واضح طور پر پیش کر دیا۔ اور اپنی کارروائی کے دائرہ کو صرف نقصانات کے معاوضہ

تک محدود رکھا اور ہر قسم کی پارٹی اسپرٹ اور ذاتی مخاصمت سے علیحدہ رہے۔

دورانِ قیام میں مختلف سوسائٹی اور جلسوں میں شریک ہوئے اعلیٰ طبقہ کی متعدد دعوتوں میں ان کو مدعو کیا گیا۔ بعض موقعوں پر برجستہ تقریریں بھی کرنی پڑیں تعلیم گاہوں کو دیکھا اور کیمبرج کانووکیشن میں شرکت کی۔ مختلف مقامات کی سیر و تفریح میں بحری فوج کا دفتر اور بحری مدرسوں کا معائنہ بھی شامل تھا۔ امیر البحر نے نہایت تپاک سے خوش آمدید کہا۔ ہندوستان کے سابق حکام کے ساتھ دوستانہ ملاقاتیں ہوئیں۔ لارڈ رپن نے مضافات لندن میں اپنے مکان پر مدعو کیا۔ انگلستان کے مشہور مدبر وزیر اعظم مسٹر گلیڈ اسٹون سے بھی بہت طویل اور دلچسپ ملاقات ہوئی جس کی تفصیلی کیفیت ٹائمس (لندن) نے شائع کی اور اس پر لیڈر بھی لکھا۔

تقریباً چھ مہینے کے قیام کے بعد وہ واپس ہوئے اور جس مشن پر کہ وہ گئے تھے اس میں انھوں نے ایسی کامیابی حاصل کی کہ نہ صرف نواب سر آسمان جاہ نے اس کا اعتراف کیا بلکہ سر مارٹیمر ڈیورنڈ فارن سکریٹری نے بھی قدر دانی کا اظہار کیا اور اپنی چٹھی مورخہ ۲۵ نومبر ۱۸۸۸ء میں لکھا کہ:-

"ہر شخص کو اس سے اتفاق ہو کہ آپ نے انگلستان میں اپنا کام نہایت قابل تعریف دور اندیشی اور دانشمندی کے ساتھ انجام دیا ہو اور جو کچھ آپ پر اعتماد کیا گیا تھا آپ نے پوری طرح اس کو نبایا ہے۔"

جون ۱۹۰۸ء میں لیپل گریفن نے لندن کے کالونیل انسٹی ٹیوٹ میں ایک لکچر دیا تھا جس میں ہندوستانی ریاستوں کے انتظامات اور والیان ملک کی قابلیتوں، فضول خرچیوں اور عیش وعشرت کی مصروفیتوں، رعایا کی زار و نزار حالتوں کی نسبت ایک خاص زہریلے انداز میں شدید ترین حملہ تھا - اور خاص کر یہ زہر مسلمان ریاستوں اور رئیسوں کی نسبت بہت زیادہ اُگلا تھا - اور مسلمانوں کو بربنائے مذہب اسلام سلطنت برطانیہ کا خطرناک دشمن ثابت کیا تھا، کانگریسی گروہ کو بھی اپنے تیروں کا ہدف بنایا تھا اور ضمناً حیدرآباد کے معاملات اور خاص کر قضیۂ معدنیات کی نسبت بھی ایسے الفاظ استعمال کئے تھے جس سے بُرائی اور ذم کا پہلو نکلتا تھا اور چونکہ وہ ایک عرصہ تک ہندوستان میں رزیڈنٹ رہ چکے تھے اور ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں ایک اتھارٹی سمجھے جاتے تھے، اس لئے برطانوی پبلک کے خیالات میں تغیر پیدا ہونے کا ضرور اندیشہ تھا -

نواب محسن الملک نے اس کا جواب انگلستان کے مشہور رسالہ نائن ٹینتھ سنچوری اور متعدد معتدر اخبارات میں شائع کرایا - جس میں انھوں نے اگرچہ حیدرآباد کے ڈیفینس کو بہت زیادہ پیش نظر رکھا تھا لیکن دوسرے اعتراضات وخیالات کی تردید کو بھی نظرانداز نہیں کیا اور بحیثیت ایک مسلمان کے اُن تمام الزامات کی تردید کی جو مسلمانوں کی نسبت لگائے گئے تھے اور بحیثیت ایک ہندوستانی محب وطن کے اراکین کانگریس کے الزامات کی بھی مدافعت کی -

نواب صاحب کا مضمون تصورات، اوہام اور رنگ آمیزی و لفاظی پر مبنی نہ تھا جیسا کہ سرلیپل گریفن نے اپنے لکچر میں طرز و انداز اختیار کیا تھا بلکہ انھوں نے واقعات کو اپنے مخصوص طرز انداز کے ساتھ بیان کر کے موقع بموقع اعداد کی قوت کے ساتھ اس کو پُر زور بنایا تھا۔

اس جواب پر ہر طرف سے تحسین و آفریں کی گئی۔ اور مجبوراً سرلیپل گریفن کو اپنے جواب الجواب میں حیدر آباد کے متعلق عذر و معذرت سے کام لینا پڑا۔

انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۸۹۳ء تک اسی منصب پر اپنی خدمات کو انجام دیتے رہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس زمانہ میں اُمرا اور عہدہ داروں کی باہمی رقابتیں جو کچھ عرصہ پہلے دبی ہوئی تھیں پوری قوت کے ساتھ اُبھریں اور سرمحلی ہوڈن کی تائید و حمایت سے اُنھوں نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ نواب صاحب بھی اُن کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے اور اُن حالات کی بنا پر مجبور ہو کر مستعفی ہونا پڑا۔ اِن کا استعفا منظور کر لیا گیا اور اٹھ سَو روپیہ ماہوار کی پنشن عطا کی گئی۔

نواب صاحب نہایت عزت و احترام کے ساتھ حیدر آباد سے رخصت ہوئے۔ اسٹیشن پر نہ صرف ہندوستانی اور یورپین عمائد ہی مشایعت کے لئے موجود تھے بلکہ ہر طبقہ کے آدمی اپنے محسن کو رخصت کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور ہر شخص اس جدائی کے صدمہ کو محسوس کر رہا تھا خصوصاً وہ غربا اور یتامیٰ اور ایامیٰ جن کی کفالت و اعانت میں نواب صاحب دو ڈھائی سو روپیہ ماہانہ صرف کیا کرتے تھے جسرت

اور رنج والم کا مرقع نظر آتے تھے۔

(۴)

نواب صاحب کی فطرت میں قدرت نے اور فضائل کی ساتھ قومی جوش بھی ودیعت رکھا تھا جو اوائل میں میلاد خوانی جمعہ کے مواعظ اور آیات بینات کی تصنیف کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا لیکن قدرت کو ان سے اور بلند کام کرانے مقصود تھے۔ چنانچہ تحصیلداری کے زمانہ میں سرسید مرحوم سے تعلقات شروع ہوئے اور اس طرح کہ ۱۸۶۳ء میں جب سرسید کی مشہور کتاب تبئین الکلام شایع ہوئی تو اُس سے طبقۂ علما میں ایک شور برپا ہوگیا۔ نواب صاحب نے بھی اس کو دیکھا اور بغیر کسی تعارف کے سرسید کو ایک خط لکھا جس میں اُن کے عقائد پر سخت حملہ تھا اور ان کو تقریبًا کافر و مرتد قرار دیدیا تھا۔ لیکن سرسید کے نرم و شیریں جواب نے اور پھر دو چار ملاقاتوں اور صحبتوں نے جس میں قومی و مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیالات اور بحث و تمحیص رہی نواب صاحب کو سرسید کا شیفتہ اور اُن کے مشن کی امداد کا گرویدہ بنا دیا، اور اُنھوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ جو کچھ اُن کے امکان میں ہوگا وہ سرسید کے مشن کی امداد سے دریغ نہ کریں گے۔

اس کے بعد وہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبروں میں داخل ہوئے اور اس کے استحکام و ترقی پر اپنی توجہات مبذول کیں اور جب سرسید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے

تو اُن کو سوسائٹی کے سنبھالنے کی بہت زیادہ اُمید نواب صاحب سے ہی تھی اور جب دورانِ قیام لندن میں خطبات احمدیہ کی تصنیف کا کام شروع کیا تو نواب صاحب نے اس کام میں زبردست اعانت کی وہ احادیث و تفاسیر کے اقتباسات بھیجتے اور اہم مسائل میں مشورہ دیتے اس کے علاوہ مالی امداد اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ اپنی پوری تنخواہ اور قرض لے کر دی اور دوست و احباب سے چندے بھی وصول کر کے بھیجے۔

اس زمانہ میں سرسید کے دل میں قومی بھلائی اور ترقی کے جو خیالات پیدا ہوتے یا جو ارادے اور حوصلہ وہ کرتے اُن سے نواب صاحب کو اطلاع دیتے اور یہاں سے وہ ہمیشہ حوصلہ افزا جوابات لکھتے۔

سرسید کے دل پر نواب صاحب کی اس تائید و امداد اور خلوص و محبت اور کمالات و فضائل علمی کا جس قدر گہرا اثر پڑا تھا اس کا کسی قدر اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو سرسید نے اُن کو لندن سے لکھے ہیں اور مجموعہ خطوط سرسید میں شایع بھی ہو چکے ہیں۔ یہاں ہم تین خطوں کا بہت مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ —

"جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہو بیان نہیں کر سکتا اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی جس محبت سے لکھا تھا وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں

پہونچا تھا۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محیت ہوا کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلے کا عقدہ حل ہوتا تھا ؎

میانِ احمد و مہدی نہ ہیچ ہست حجاب
تو خود حجاب خودی احمد از میان برخیز

یہ بے تصنع آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کی شکستہ رقم نے اور بھی زیادہ لطف دیا۔ دو تین دفعہ پڑھنا پڑا۔ ایک دفعہ کے پڑھنے میں جو نقطہ رہ گیا تھا دوسری دفعہ نکلا اور بہت زیادہ مزا دیا۔ اُسی وقت میرے دل میں مرزا مرحوم کا یہ شعر گزرا ؎

ز لکنت می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہر بارش
شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویش ست گفتارش"

ایک طولانی خط میں ایک مضمون کے متعلق جو نواب صاحب نے شائع کیا تھا لکھتے ہیں کہ :۔

"حقیقت میں ۳۰ر اپریل کے اخبار میں جو مضمون چھپا ہے وہ الہام یا القارِ غیبی ہے۔ نہایت عمدہ ہے اگر میں یہودی ہوتا تو بجائے عزیر بن اللہ کے "مہدی ابن اللہ کہتا۔ تو یہ استغفرنا.......

خدا معاف کرے ؎

قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش
اصطلاحِ شوقِ بسیار است دمن دیوانہ ام"

ایک اور خط کا فقرہ ملاحظہ ہو :-

"آپ کی تحریرات جو اخبار میں چھاپہ ہوئیں اُن سے میرا دل اس قدر خوش ہوا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا جو جو مقام مجھ کو اس میں ملے ہیں اس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے۔ جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا و بے نظیر ہاتھی اس کی ادگی میں آن پھنسے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ نکلنے والا نہیں"

لندن سے واپسی کے بعد آخر ۱۸۷۰ء میں سر سید نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت میں جہالت کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اور مذہب کے متعلق جو غلط عقائد و خیالات راسخ ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ نواب صاحب اس رسالہ کے اُن بہترین مضمون نگاروں میں سے تھے جن کی تحریروں نے اس کو خاص امتیاز بخشا تھا۔ وہ اکثر مذہبی، اخلاقی اور تمدنی مضامین لکھتے تھے جن میں وسیع الخیالی، قوتِ فکری، استدلال اور اجتہاد کے علاوہ ادائے مطالب میں با موقع تشبیہات و استعارات اور ضرب الامثال سے خاص لطافت پیدا ہو جاتی تھی اور اس طرح انھوں نے اُردو ادب میں ایک خاص امتیاز

حاصل کرلیا تھا۔

بقول شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب :۔

"نواب محسن الملک جو کچھ لکھتے تھے اس میں ایسی لطافت ہوتی تھی کہ لوگ اُن کے مضامین کو پڑھ کر سر دُھنتے تھے، سرسید پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے تھے ان کے جواب وہ ایسی دل ربا ظرافت اور فصاحت سے دیتے تھے کہ سرسید کے حریف دنگ رہ جاتے تھے اور اُن سے کوئی معقول جواب بن نہیں پڑتا تھا"

ان مضامین کی وجہ سے سرسید کے دست و بازو نواب محسن الملک و دوسرے رفیق نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین بھی تکفیر و زندقہ اور الحاد کے تیروں سے محفوظ نہ رہے۔ چنانچہ سرسید نے ان تعصبات سے متاثر ہو کر تہذیب الاخلاق کے ایک نمبر میں نہایت دردِ دل سے لکھا کہ :۔

"اب ہمارے محبوب مہدی علی خاں اور ہمارے عزیز مشتاق حسین کا حال سنو۔ یہ ہمارے دونوں دوست ایسے ہیں جن کا حال کچھ چھپا نہیں ہے مولوی مہدی علی کا علم، اس کی ذاتی خوبیاں، اس کی پیاری پیاری باتیں، اس کی سچی ایمان داری، اس کی فصیح تقریر اس قابل ہیں کہ اگر ہماری قوم کے دل کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتے منشی مشتاق حسین کی ذاتی نیکی اور نہایت سخت دینداری بے ریا عبادت

سچی خدا پرستی، غایت تشدّد سے نماز روزہ اور احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے، اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے۔ مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے کہ ایک رائے یا ایک مسئلہ یا ایک آبائی رسم و رواج کے اختلاف کے سبب ایک کو نہایت حقارت سے حواری جس سے اشارہ عیسائی کا رکھا ہے اور دوسرے کو ملحد کا خطاب دیا ہے۔ "کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔" مگر ہمارے ان دونوں دستوں کو خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ ان کو بعوض سچائی اور دینداری کے یہ خطاب انھی کی قوم سے ملے ہیں جن کی وہ بہتری چاہتے ہیں ؎

نیک باشی وبدت گوید خلق

بہ کہ بد باشی و نیکت گوید"

سرسید نے اسی سال دوسرا کام یہ کیا تھا کہ ایک کمیٹی "خواستگار تعلیم مسلمانان" بنارس میں قایم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی تحقیقات کرے کہ مسلمان سرکاری مدارس میں کیوں کم تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور کیوں علوم جدیدہ ان میں رواج نہیں پاتے اور علوم قدیمہ کیوں گھٹ گئے ہیں اور کیا تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان کی اختیار کی جائیں۔ اس کمیٹی نے ایک اشتہار کے ذریعہ سے مسلمانوں سے بطور جواب مضمون اس مسئلہ پر رائے طلب کی تھی اور بہترین مضامین کے لئے تین انعام پانسو، تین سو

اور ڈیڑھ سو کے تجویز کئے تھے۔

نواب صاحب نے ایک مدلل و مفصل مضمون بنام "انشراحات صدویہ" لکھا اور سب کمیٹی نے اس کو اول درجہ کا تجویز کر کے پانسو روپیہ کے انعام کا مستحق قرار دیا لیکن اُنھوں نے انعام لینے سے انکار کر دیا۔

اس کمیٹی کی کارروائی کے نتیجہ کے طور پر ایک مدرسۃ العلوم کی بنا ڈالنے کی تجویز طے ہوئی اور اس کے قیام کے لئے ایک کمیٹی خزینۃ البضاعت قائم کی گئی۔

نواب صاحب نے اس کمیٹی کی مالی امداد کے لئے علاوہ اپنے چندہ کے دوسروں سے بھی چندہ دلایا اور مرزاپور میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ایک سب کمیٹی بنائی اور رہر طبقہ کے اصحاب جن میں بعض عالم بھی تھے اس کے ممبر ہوئے اور فراہمی چندہ کے لئے کوششیں کیں۔ یہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا کہ طبقہ علماء کی طرف سے مدرسۃ العلوم کے قیام کی مخالفت کی جا رہی تھی۔ کتابیں اور رسالے شائع ہوتے تھے ایک بڑے نامی عالم نے ایسی ہی ایک کتاب شائع کی تھی جس کے آخر میں چند علماء کے فتوے بھی درج تھے لیکن نواب صاحب کامیابی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔

لیکن ابھی مدرسۃ العلوم کے تخیل نے عملی صورت اختیار نہ کی تھی کہ ان کا تقرر حیدرآباد میں ہو گیا اور یہ تقرر بھی اس تجویز کے لئے تائید غیبی بن گیا۔ کیونکہ اب اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سرمایہ اور روپیہ کی ضرورت تھی اور نواب صاحب نے حیدرآباد میں اس ضرورت کے پورا کرنے میں جس طرح مدد پہنچائی وہ سرسید کے

الفاظ میں ہی بیان کرنا مناسب ہے:-

"مہدی علی کو معلوم ہوا کہ تعمیر مدرسۃ العلوم میں چندہ کی دقت ہے اور میں قرض لے کر اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں اسی وقت ایک ہزار آٹھ سو نقد اپنے پاس سے چندہ میں بھیج دیا اور چھ ہزار روپیہ خود اپنی دستاویز تحریر کر کے حیدرآباد میں قرض لیا اور مدرسہ کی تعمیر میں صرف کرنے کو بھیج دیا۔ یہ ایک ادنیٰ حالت اس ہمارے پیارے دوست کی ہے جس سے ہم اپنی بدنصیبی سے بجز ترش روئی کے اور کسی طرح بات نہیں کرتے"

(۱۱ اکتوبر ۱۸۷۹ء)

یہ امداد آئندہ اور بڑی امدادوں کی تمہید تھی۔ چنانچہ نواب صاحب کی تنخواہ میں ہمیشہ کالج کی مختلف مدات کا حصہ ضرور شامل رہتا اور اضافہ مدارج ومشاہرہ کے ساتھ رقم کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا۔

غرض کوئی فنڈ ایسا نہ تھا جو اُن کے عطیات کا رہینِ منت نہ ہو، اور کوئی عمارت جو چندہ سے بنائی گئی ایسی نہ ملے گی جس میں نواب صاحب کی امداد نمایاں نہ ہو۔ اسی طرح طلباء کے وظائف، تمغوں اور انعامات میں بھی اُنھوں نے ہمیشہ فیاضانہ امداد دی۔

ان امدادوں کی شکرگزاری میں بطور یادگار سر سید نے کمیٹی کی جانب سے ایک عمارت مہدی منزل[1] تعمیر کی جو پختہ بارگ کے شمالی کونے اور لٹن لائبریری

---

[1] ملاحظہ ہو نوٹ صفحہ ۴۴

کے مابین واقع ہے۔

۱۸۹۱ء میں سرسید کی یادگار کی تحریک ہوئی تو انھوں نے درم اور قلم سے پُرزور تائید کی ۱۸۸۲ء میں جب سر سید حیدرآباد ڈپوٹیشن لے کر گئے تو ایک ہزار روپیہ نقد پیش کیا۔ اسی طرح بجٹ کی کمی پورا کرنے کے لئے اکثر قوم دیں۔ غرض ہمیشہ اولوالعزمی و فیاضی کے ساتھ مدد کرتے رہتے تھے۔

ان امدادوں کے علاوہ جو وہ اپنی ذات سے دیتے تھے، دولت آصفیہ اور سرسالار جنگ اول کی امدادوں میں بھی نواب صاحب کی مساعی کا خاص حصہ تھا۔ علاوہ بریں وقتاً فوقتاً جب وہ شمالی ہند میں کسی تقریب سے آتے، کالج کا معائنہ کرتے اس کے انتظامی معاملات میں مشورہ دیتے طلبا اور اسٹاف سے ملاقاتیں کرتے رہتے۔

۱۸۹۰ء کے آخر میں جب شمالی ہند میں آئے تو الہ آباد کے اجلاس کانفرنس میں پہلی مرتبہ شریک ہوئے کیوں کہ گزشتہ سالوں میں جب سے کہ کانفرنس قایم ہوئی تھی اپنے فرائض اور بُعدِ مسافت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکتے تھے انھوں نے اس اجلاس میں ایک معرکۃ الارا مضمون پڑھا جو تین حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصہ ایک جداگانہ لیکچر تھا۔ پہلے حصہ میں مسلمانوں کی ملکی اور تمدنی اور علمی ترقی و تنزل کی مختصر

لـه۔ اس عمارت میں اب سائنس لیباریٹری ہے اور اس کا خوشنما برآمدہ جس میں کتبہ لگا ہوا ہے بند کر دیا گیا ہے جس سے نہ صرف عمارت کی خوبصورتی میں فرق آگیا بلکہ وہ کتبہ بھی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا کاش یونیورسٹی کے منتظمین اس یادگار کو اصلی حالت پر قایم رکھتے اور لیباریٹری کے لئے دوسری عمارت بنا لیتے۔

تاریخ اور ترقی و تنزل کے اسباب کا بیان تھا اور دوسرے حصہ میں یونان کی ترقی اور زوال اور یورپ کے تنزل اور ترقی کا ذکر تھا مع ان کے اسباب کے تیسرے حصہ میں ان اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے مسلمانوں کے مستفید نہ ہونے کا تذکرہ تھا۔

ان لیکچروں کے لئے دو دن رکھے گئے تھے لیکن تیسرا لیکچر پھر بھی رہ گیا اور افسوس ہے کہ وہ طبع بھی نہ ہو سکا۔

اگرچہ تہذیب الاخلاق کے مضامین نے علمی و ادبی طبقہ میں ان کے فضائل علمی کا سکہ قایم کر دیا تھا اور حیدرآباد جانے کے بعد تمام ہندوستان میں بحیثیت ایک اسٹیٹسمین اور مدبر ملک کے ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی لیکن ایک پبلک جلسہ میں جہاں بڑے بڑے مقرر اور لیکچرار اور ادیب جمع تھے یہ پہلا اتفاق تھا کہ اُنھوں نے ایسا جامع مبسوط پُر از معلومات اور فصیح و بلیغ مضمون پڑھا اور اپنی سحر بیانی اور طرز ادا سے سامعین کو محو حیرت بنا دیا۔

(۵)

۱۸۹۳ء کے وسط میں جب نواب صاحب حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہوئے تو اُس وقت اُن کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی لیکن بجائے اس کے کہ وہ وطن میں یا کسی صحت بخش مقام پر رہ کر اپنی صحت کی طرف توجہ کرتے اُنھوں نے علیگڑھ میں قیام کرنے کا تہیہ کر لیا تاکہ سرسید کے شاندار کام کی تکمیل میں اپنی بہترین قوتوں سے مدد پہنچائیں۔

اسی سال وہ اجلاس کانفرنس کے پریسیڈنٹ ہوئے جو علی گڑھ میں منعقد ہوا
تھا۔ اُنھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک خاص دلربایانہ انداز سے کانفرنس کی غرض
اس کے اغراض و مقاصد اور اس کی تکمیلی کوششوں پر بہت زیادہ زور دیا تھا۔ اور پھر اسی
مقصد کو اپنی تمام ضمنی تقریروں میں پیش نظر رکھ کر قوم کو توجہ دلائی تھی۔

اس کے بعد نہایت زبردست تقریر کی جس کو کانفرنس کے لٹریچر میں ایک خاص
مرتبہ حاصل ہے۔

یہ تقریر ایک رزولیوشن کے متعلق تھی جس کو سر سید نے پیش کیا تھا اور جو ایک
اہم سوال بن گیا تھا کہ "مسلمان من حیث القوم مردہ ہیں یا زندہ۔

سر سید مرحوم مردہ تصور کرتے مگر نواب صاحب اس کے مخالف تھے، ان کا
خیال تھا کہ قوم زندہ ہے ورنہ اتنی قلیل مدت میں اتنا بڑا کالج بایں شان و شوکت
کیسے قایم ہو جاتا۔

نواب صاحب نے پہلے ہی اجلاس میں اندازہ کرلیا کہ اگر کانفرنس کو سعی و ہمت کے
ساتھ چلایا گیا تو قومی تعلیم اور کالج کو بہت کچھ ترقی ہوگی۔ اس لئے اُنھوں نے اس
خدمت کو اپنے ذمّہ لیا۔ صاحب الرّائے اصحاب سے مشورے کئے، گشتی خطوط جاری
کئے مختلف مقامات میں دورے کرتے رہے کانفرنس کے تمام جلسوں میں شریک ہوئے
۱۸۹۵ء کے اجلاس میں دوبارہ فرائض صدارت انجام دیئے اور ایک عام بیداری
خاص کر صوبہ متحدہ میں پیدا کردی۔ وہ سال کا کچھ حصہ رستی و بقائے صحت کے لئے

بمبئی میں بسر کرتے تھے لیکن یہاں بھی تمام وقت کالج اور کانفرنس اور قومی تعلیم کی ترقی و بہبودی کی جد وجہد میں صرف ہوتا تھا۔ اسی مقصد کے لئے اخبارات جاری کرائے مسلمانوں کی انجمنوں، کمیٹیوں اور سوسائیٹیوں میں تقریریں کیں۔ پرائیوٹ صحبتوں میں بھی مسائل زیر بحث رہے اور ایک عام رجحان قومی تعلیم اور کالج کی طرف پیدا کر دیا بمبئی کے اس قیام کا سب سے زیادہ قیمتی نتیجہ یہ تھا کہ ہز ہائینس آغا خاں کے اثر و اقتدار اور فیاضی کا رخ قومی مقاصد و اغراض کی جانب مائل ہو گیا۔

انھوں نے کالج کی عام حالتوں میں بہت سی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی اور کوشش کی کہ صورت حالات کو بدلیں مگر ان معاملات میں اپنے آپ کو بے بس پایا اور اسی وجہ سے سرسید کے آخر زمانہ میں ان دونوں محترم دوستوں میں اختلاف رائے بھی پیدا ہو گیا جس نے ایک خطرناک طوالت اختیار کی۔

نواب صاحب نے کئی مرتبہ ٹرسٹی شپ سے مستعفی ہونے کا ارادہ کیا لیکن پھر سرسید کی عظمت و محبت اس ارادے پر عمل کرنے سے مانع رہی۔

۱۸۹۵ء میں جب ایک لاکھ روپیہ کے غبن کا راز کھلا اور سرسید دل شکستہ ہو گئے تو نواب صاحب نے اولاً خود ایک ہزار روپیہ اس نقصان کی تلافی کی مد میں پیش کیا اور پھر وہ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے سرگرمی کے ساتھ میدان عمل میں آئے اور باوجود ان تمام اختلافات کے جو گزشتہ چار پانچ سال میں پیدا ہوئے ایک لمحہ کو بھی اس محبت و دوستی اور ادب و احترام اور مخلصانہ سرگرمی میں کوئی کمی نہیں تھی وہ سرسید کے

آخری لمحات میں بھی ہر وقت اُن کے پاس موجود رہتے اور اُن کی تسلّی و تشفی کرتے رہتے تھے۔

(۶)

سرسید نے ۱۸۸۹ء میں اپنے بعد سیّد محمود کی جانشینی کا مسئلہ طے کرالیا تھا جو بہت سے اختلافات اور مخالفتوں کا سبب بن گیا تھا اور جس سے آغاز کار کے ممتاز و با اثر رفقاء نے علیٰحدگی اختیار کرلی تھی۔

سیّد محمود بلا شبہ سرسیّد کے بہترین جانشیں ہوتے۔ کیونکہ ان میں وہ تمام قابلیتیں موجود تھیں جو ایک قوم کی رہنمائی اور ایک تعلیمی انسٹی ٹیوشن کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے درکار ہیں اس کے علاوہ کالج کے قیام اور سرسید کی قومی مساعی میں سیّد محمود کی قابلانہ مساعدت و امداد ابتدا سے شامل تھی لیکن قومی بدقسمتی سے اب ان کی حالت کا یہ اقتضا نہ رہا تھا کہ وہ اس اہم ذمّہ داری کے فرائض کو ادا کر سکتے تاہم اُنھوں نے سرسیّد کے بعد سکریٹری شپ کا چارج لیا۔

نواب محسن الملک نے اپنی ہمّت و توجہ کالج کو مالی مصیبتوں سے نجات دلانے پر مبذول کی اور اس عام رنج والم کی حالت میں جو سرسیّد کی وفات سے تمام مسلمانوں پر طاری تھی بغیر ایک لمحہ ضائع کئے ہوئے سرسید میموریل فنڈ قایم کیا اور کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا سوال قوم کے سامنے پیش کیا۔

میموریل فنڈ کو ہزاکسلنسی لارڈ ایلجن وسیرائے ہند اور ہزآنر سرجیمس لاٹوش لفٹنٹ گورنر

صوبہ متحدہ کی امداد و حوصلہ افزائی سے بڑی تقویت ہوئی۔ نواب صاحب اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے، انھوں نے جا بجا کمیٹیاں قایم کرائیں۔ صوبہ متحدہ اور پنجاب کا دورہ کیا، لاہور کے عظیم الشان جلسہ میں ایک نہایت پر اثر اور مبسوط تقریر کر کے یونیورسٹی کی ضرورت اور اہمیت محسوس کرائی۔

پھر دسمبر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی لاہور میں منعقد کرایا اور قومی سرگرمیوں میں تازہ روح پھونکی۔ لیکن سید محمود کی حالت سے بہت مایوسی تھی اور بجائے اصلاحوں کے خرابیاں اور آسانیوں کی جگہ دشواریاں پیدا ہو رہی تھیں بالآخر وہ دس ماہ بعد اس عہدہ سے معزول کئے گئے اور سکریٹری کے عہدہ پر نواب محسن الملک کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۷)

حقیقت یہ ہے کہ کالج اور قومی مقاصد کے لئے یہ نہایت پُر آشوب زمانہ تھا کالج مالی حالت کے لحاظ سے دوالیہ ہو چکا تھا اس کا مالی اعتماد اٹھ چکا تھا قرض کا بارِ گراں تھا جس میں سودی قرضہ بھی شامل تھا۔ مشاہرات کی ادائگی بھی مشکل ہو رہی تھی۔ انتظامی لحاظ سے بھی عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی، قواعد و قوانین ناقص تھے۔ پھر ٹرسٹیوں پر جن سے ایسے نازک وقت میں مدد ملنے کی امید ہونی چاہیے تھی ایک عام جمود طاری تھا اور جو کچھ کام کرتے تھے اُن میں پارٹی اسپرٹ اور

اور پارٹی فیلنگ تھا۔ اسٹاف کی یہ زبردست خواہش تھی کہ وہ کالج کی علمران جماعت کے اقتدار کو زائل کرکے آزادانہ طور پر اپنا اقتدار قائم کرے۔ طلبا کی تعداد میں معتدبہ کمی تھی۔ ضروری عمارتیں ناتمام تھیں جن کی تکمیل کی فوری ضرورت تھی کالج کی حالت کو مستحکم کرنے کے لئے اخراجات کی زیادتی بھی ناگزیر تھی اور گورنمنٹ کی مداخلت بھی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔

پھر اسی زمانہ میں ہزآنر سر انٹونی میکڈانل لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے سرکاری دفاتر سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو خارج کرکے مسلمانوں میں ایک عام ہیجان پیدا کردیا تھا۔ چونکہ علی گڑھ مسلمانوں کی تمام قومی تحریکات کا مرکز تھا اور اس کا سکریٹری ان تمام تحریکوں میں رہنما تھا، اس لئے نواب صاحب کو ہزآنر کے اُس حکم کے خلاف احتجاج میں شریک ہونا پڑا اور انھوں نے احتجاجی جلسوں میں حصہ لیا جس سے مخالف پارٹی کو ایک نادر موقع ان کی مخالفت کا حاصل ہوگیا اور ہزآنر کا مزاج سخت برہم کردیا گیا جس کا اثر کالج کے انتظام اور پالسی پر بھی پڑا۔ اور ہزآنر کی بعض مداخلتوں سے پارٹی اسپرٹ کو تقویت پہنچی۔

اسٹاف کا رویہ اور طرز عمل بھی بدل گیا۔ خودمختارانہ جذبات کے ساتھ تنخواہوں کے اضافہ کا مطالبہ شروع ہوا مگر "آفریں باد بریں ہمت مردانۂ او" نواب صاحب نے ان تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بے انتہا دلیری، جوش اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ وہ میدان مقابلہ میں آئے اور کامیاب ہوئے۔

اُنھوں نے ایک طرف ہیڈ کوارٹر میں رہ کر ان مصائب سے نجات و مخلصی کی تدابیر کیں، دوسری طرف ملک میں دورے کر کے اور مختلف صوبوں میں کانفرنس کے اجلاس منعقد کرا کے اپنی حسنِ تدبیر، لاثانی قابلیت اور اعجاز نمائی سے قوم کو قومی تعلیم اور قومی تعلیم گاہ کی جانب متوجہ کیا ؎

دم بھر نہ کبھی جان کو آرام دیا خدمت کے لئے قوم کی مر مر کے جیا
پیری ہوئی سدِ راہ اس کی نہ مرض صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

(حالی)

اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ہجومِ مصائب و افکار اور بعض رفیقوں کی مخالفانہ کارروائیوں نے ان کو پریشان کر دیا اور وہ خستہ اور بددل ہو ہو گئے، ایسی نوبت بھی آئی کہ اُنھوں نے اپنے مستعفی ہونے میں قومی مفاد کی حفاظت خیال کی خصوصاً جب سر انٹونی میکڈانل کی ناراضی اس درجہ بڑھ گئی کہ اس نے ذاتی مخاصمت کی صورت اختیار کر لی اور سکریٹری کی رائے کی آزادی کو بھی سلب کرنا چاہا تو وہ مستعفی ہونے پر قطعی آمادہ ہو گئے لیکن کچھ خالص مخلص رفیقوں (خصوصاً نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین) کی ہمت و معاونت اور ہز آنر سر جیمس لاٹوش کی (جو سر انٹونی میکڈانل کے جانشین ہوئے تھے) سچی ہمدردی و حوصلہ افزائی اور دانشمندانہ پالیسی نے ان کو مستعفی ہونے کے ارادہ سے باز رکھا۔

یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر نواب صاحب مستعفی ہو جاتے تو مسلمانوں کا

یہ سرمایۂ ناز دارالعلوم ہی خطرہ میں نہ پڑ جاتا بلکہ قومی تعلیم کو وہ نقصان پہنچتا جس کی تلافی صدیوں میں بھی ممکن نہ ہوتی۔ مگر خدا نے اپنی رحمت کو ہز آنر سر جیمس لاٹوش کی صورت میں نازل کیا اور یہ سب سے بڑا خطرہ بھی رفع ہو گیا۔ اور ترقی و سرسبزی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ساتھ ہی سر جیمس نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ گورنمنٹ ذاتی رائے پر کوئی روک قایم کرنا نہیں چاہتی۔

(۸)

سرسیّد کی زندگی میں کانفرنس کے جو گیارہ اجلاس منعقد ہوئے وہ ممالک متحدہ اور پنجاب تک محدود رہے۔ نواب صاحب نے اپنی زندگی کے آٹھ سال میں صوبۂ متحدہ اور پنجاب کے علاوہ مدراس، بمبئی، کلکتہ، رنگون، ڈھاکہ تک میں اجلاس منعقد کرائے جو اپنی عظمت و شان اور شرکا کی کثرتِ تعداد کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔

مدراس میں سوتوں کو جگایا جاکر غُل علم کا برہما میں مچایا جاکر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی واں آبِ حیات ان کو پلایا جاکر
(حالی)

پھر یہی نہیں کہ تعلیم کا پیغام سُنایا، علم کی منادی کی، بلکہ کالج کی ترقی و استحکام کے لئے گراں قدر رقوم حاصل کیں۔ ہندوستان کے ہر گوشہ سے قومی دارالعلوم میں طلبا کی آمد شروع ہو گئی۔ خود اطراف و اکناف ہند میں دورے کئے مدارس

اور رنگون و آسام تک کا سفر کیا۔ عام مسلمانوں میں کالج کی ہمدردی پیدا کی۔ علماء کے طبقہ میں جو منافرت تھی اس کو دور کیا۔ بڑے بڑے امراء و تجار کی فیاضی کا رُخ قومی تعلیم کی جانب پھیرا۔ اور ہزاروں روپئے چندوں میں وصول کئے اور قومی یونیورسٹی کا خیال ہر طبقہ کے مسلمانوں کے دلوں میں راسخ و جاگزیں کر دیا اُن کو قومی تحریکات کا دل دادہ بنایا، قومی اخبارات نے کالج کے مباحث اور اشاعتِ حالات میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا۔

اُنھوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو جو بند ہو چکا تھا پھر جاری کیا اور اس کو کالج کے حالات کی تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ اور قومی پالیسی کا مبلّغ بنایا۔

انجمن القرض کو وسیع کیا اور کالج کے قابل اور ہونہار طلبہ کو ہر حصۂ ملک میں بھیجا کہ غریب طلباء کے لئے چندے جمع کریں اور مسلمان نوجوانوں کو اپنے قومی کالج میں داخل ہونے کی ترغیب دیں۔ چنانچہ طلباء کے ان ڈپوٹیشنوں نے لاکھوں روپئے جمع کئے اور ریاستوں میں خود جاکر والیانِ ملک اور اُن کے وزراء اور با اثر اصحاب سے ملاقاتیں کر کے امدادیں مقرر کرائیں۔

کالج نے اس عرصہ میں جو شہرت و عظمت حاصل کی اس کے اثر سے اکثر بڑے بڑے مقتدر اصحاب نے کالج کا معائنہ کیا۔

والیانِ ملک اور حکام صوبہ کے علاوہ دیر رائل ہائینس پرنس و پرنسس آف ویلز ہز میجسٹی ضیاء الملۃ والدین حبیب اللہ امیر افغانستان کی تشریف آوری کالج کے وہ

تاریخی واقعات ہیں جو نواب صاحب کی مساعیِ جمیلہ کے نہایت شاندار نتائج
ہیں اور جن پر مسلمانوں کو من حیث القوم ہمیشہ ناز رہے گا۔

عاقبت مقبولِ کالج بدیں غایت رسید
تربیت گاہِ غریباں شد گزرگاہِ شہاں (حالی)

مالی حالت کی ترقی کے ساتھ کالج کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی، عربی تعلیم کا
انتظام ہوا اور پرنس آف ویلس سائنس اسکول قائم کیا گیا۔ ٹیچنگ اسٹاف اور
پروفیسروں میں اضافہ ہوا۔ اُن کی درجہ بندی اور مشاہرات کا گریڈ مقرر کیا گیا اور
ترقیاں دی گئیں۔ غیر مکمل عمارتیں مکمل ہوئیں۔ اسٹریچی ہال کے دونوں جانب لٹن
لائبریری، بیگ منزل، حمید منزل، برکت علی خاں لیکچر روم، آسمان منزل، نظام
میوزم کی تکمیل ہوئی۔ صدر دروازے کے مغربی جانب کے کمروں اور ڈنچ کورٹ
کا سلسلہ پورا ہوا۔ مسجد کی تعمیر کا سلسلہ بھی جاری کیا، مینار اور گنبد تیار کرائے ان کے
علاوہ کرزن ہاسپٹل، ممتاز لاٹوش ہاؤس، میکڈانل ہاؤس کی جدید عمارتیں تعمیر
ہوئیں اور بعض نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی گئی یا ان پر کام شروع کیا گیا۔
ایک بہت بڑا قطعہ آراضی جو کالج سے ملحق ہے اور جنرل پیرن کا مشہور صاحب
باغ گورنمنٹ سے حاصل کیا۔
مارچ ۱۸۹۸ء میں جو کہ سر سید کے انتقال کا ماہ و سنہ ہے طلباء کی تعداد (۳۴۳)
تھی لیکن فروری ۱۹۰۷ء میں جو نواب صاحب کا سال وفات ہے (۸۹۲) تھی جس میں

نہ صرف غربا، اور متوسط طبقات کے طلبا، تھے بلکہ مرشد آباد و ڈھاکہ، مدراس، سورت، منگرول وغیرہ کے نوابوں کے لڑکے بھی تھے۔

اسی طرح ۹۹-۱۸۹۸ء میں کل مدات کی آمدنی [illegible] تھی مگر ۰۷-۱۹۰۶ء میں ایک لاکھ [illegible] پر پہونچ گئی تھی۔

جو رقوم نقد وصول ہوئیں ان کی میزان نو لاکھ [illegible] رہی آمدنی کی مناسبت سے اخراجات میں بھی اضافہ ہوا اور ۰۷-۱۹۰۶ء میں ایک لاکھ [illegible] تک اخراجات پہونچے۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اور کالج ایسوسی ایشن لندن کا قیام بھی نواب صاحب کی دلچسپی اور توجہ سے ہوا۔ مسلم گرلس اسکول بھی انھیں کی حوصلہ افزائی اور زنانہ تعلیم کی دلچسپی ایک بہترین یادگار رہی۔ اگرچہ اس کی موجودہ ترقی شیخ عبداللہ صاحب کی مشکور مساعی کا نتیجہ ہے

پیری میں جوانوں کو کیا مات اس نے — آرام پہ اپنے مار دی لات اس نے
تدبیر سے محنت سے دکھادی سب کو — کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

(حالی)

(۹)

نواب صاحب کی قابل احترام مساعی صرف ترقی تعلیم تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ وہ ملک اور قوم کی سیاسی حالت پر نظر رکھتے تھے اور یہ بالغ نظری ان میں ابتدا سے

ہی تھی لیکن ابتدائً انگریزی ملازمت اور زمن بعد حیدر آباد کی ملازمت کے سبب سے سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لے سکے تاہم وہ حالات کا بغور مطالعہ کرتے رہتے تھے سرسید نے اپنے بعض خطوں میں جو لندن سے انھوں نے نواب صاحب کے نام بھیجے تھے بعض سیاسی معاملات کا بھی اشارہ کیا ہی، اور اس سے اندازہ ہوتا ہی کہ نواب صاحب میں ابتدا سے ہی سیاسی دلچسپی موجود تھی حیدر آباد کے زمانہ میں ۱۸۸۵ء میں انھوں نے ہرات پر روسی پیش قدمی کے متعلق ایک ایسا زبردست مضمون انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جس کی دھوم تمام ہندوستان میں مچ گئی، اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ہیڈ کوارٹر سے اس کی تعریف کی گئی اس مضمون میں واقعات و حالات پر بحث کر کے ان کے نتائج کی پیش گوئی کی گئی تھی اور برطانوی گورنمنٹ کے اس طرز عمل پر جو اس نے سلطنت ترکی اور ہندوستانی ریاستوں اور ان کے افواج کے متعلق اختیار کیا تھا پُرلطف اور ہمدردانہ نکتہ چینی کر کے بعد نہایت مفید مشورے دیئے تھے۔ اس مضمون میں بعض مدبرین کی ان بدگمانیوں کی جو وہ مسلمانانِ ہند سے رکھتے تھے نہایت پُر زور طریقے سے تردید کی تھی اور ریاستوں اور ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو گورنمنٹ کا حامی اور وفادار ثابت کیا تھا۔

البتہ وہ حقوق طلبی کے ان خیالات کو جو ٹھیک اُسی سال انڈین نیشنل کانگریس کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے۔ ملک کی تمدنی و تعلیمی حالات اور گورنمنٹ کے اصول

حکمرانی اور خاص کر مسلمانوں کی پس ماندگی وغیرہ کے سبب سے مناسب نہیں جانتے تھے اور اس لئے کانگریس سے ان کو اختلاف تھا۔ اور انھوں نے اپنے ان خیالات کو کبھی مخفی نہیں رکھا۔ ۱۸۸۶ء میں وزیر اعظم انگلستان مسٹر گلیڈ اسٹون سے جو خط و کتابت ہوئی اس میں بھی کانگریس کی خواہشوں کے متعلق انھوں نے آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کی اور اپنے اختلاف کو ملکی تعلیم اور ملک میں قومی و مذہبی خیالات کے مختلف ہونے کی بناء پر قایم کیا تھا۔

۱۸۹۳ء میں سر سید اور مسٹر بیک نے سیاسی اغراض کے لئے جب محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کی ہی تو نواب صاحب اس کے ممبر ہوئے اور اس کے جلسوں میں بھی شریک ہوئے لیکن کوئی قابل لذکر دلچسپی کا اظہار نہیں کیا البتہ اپریل ۱۹۰۰ء میں سر انٹونی میکڈانل کی گورنمنٹ نے جب دفاتر سرکاری میں ناگری حروف جاری کئے جانے کا فیصلہ کر دیا اور مسلمانوں کی قومیت پر ایک کاری ضرب لگائی اور تعلیم اور لٹریچر اور زندگی کا تمام کاروبار زد میں آگیا تو نواب صاحب سخت متاثر ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے علیگڑھ میں ایک احتجاجی جلسہ کیا جس میں نہایت متانت و ادب اور گورنمنٹ کے پورے احترام کے ساتھ کارروائی کی گئی اور ایک ڈیفنس ایسوسی ایشن بنائی گئی جس کی صدارت ایک ذی مرتبہ مسلمان امیر نے کی مگر یہ احتجاج سر انٹونی کو نہایت ناگوار گزرا اور مختلف طریقوں سے اور پبلک اور پرائیویٹ طور پر انھوں نے اپنی ناگواری اور ناراضی کو

ظاہر کر دیا۔ اس ناراضی سے بعض مقتدر مسلمان اور خود صاحب صدر مرعوب ہو گئے اور انھوں نے علٰحدگی اختیار کر لی تاہم لکھنؤ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا اور نواب صاحب نے اس جلسہ میں وہ تقریر کی جو ان کی فصیح و بلیغ اور پرجوش تقریروں میں خاص طور پر ممتاز یادگار رہی۔

لیکن ایک طرف تو ہز آنر نے سیاسی و نیم سیاسی معاملات میں کالج کے سکریٹری کی شمولیت کو قابل اعتراض قرار دیا۔ دوسری طرف اکثر ٹرسٹی ہز آنر کی ناراضی سے مرعوب ہو گئے اور کالج کو شدید نقصان پہونچنے کا خطرہ ہو گیا۔ نواب صاحب نے لکھنؤ کے جلسہ کے بعد سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا تاکہ آزادی کے ساتھ میدانِ سیاست میں آئیں۔ مگر جب تک اس کا فیصلہ ہو یہ تحریک سرد ہو چکی تھی لیکن ساتھ ہی انھوں نے قوم کے سامنے یہ سوال پیش کر دیا کہ "مسلمانوں کو اپنے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔" اس مسئلہ پر خود بھی مضامین لکھے اور بحثیں کیں اور اس طرح قوم میں سیاسی تحریک کا آغاز ہوا اور تعلیم یافتہ مسلمان اس سوال پر غور کرنے لگے۔

۱۹۰۶ء میں جب کونسلوں کی اصلاح و توسیع کا مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش تھا تو نواب صاحب نے اس موقع پر حیرت انگیز سیاسی قابلیت کا اظہار کیا۔ انھوں نے بغیر ایک لمحہ ضائع کئے وقت اور موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور فوری تنظیم اور تمام مراحل طے کر کے ایک مقتدر ڈپوٹیشن مرتب کیا جس سے ہز ہائنس آغا خاں کی سرکردگی

میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہز اکسیلنسی لارڈ منٹو کے سامنے ایک ایڈریس پیش کیا جس میں مسلمانوں کے تمام قومی مطالبات کو قوی دلائل و براہین کے ساتھ درج کیا تھا۔ ہز اکسیلنسی نے نہایت ہمدردانہ جواب دیا اور کونسلوں میں مسلمانوں کے حق نیابت کو تسلیم اور ان کی پولیٹیکل اہمیت کا اعتراف کیا اور منٹو مارلے اسکیم میں جداگانہ حق نیابت حاصل ہوا۔

اس ایڈریس میں مطالبات کو ایسی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ ہندوستان و انگلستان میں اس کی تعریف و تائید کی گئی اگرچہ بنگالی اخبارات نے محض تعصب کی وجہ سے اس پر نکتہ چینیاں بھی کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ڈپوٹیشن نے ایک طرف گورنمنٹ سے مسلمانوں کے حقوق تسلیم کرائے اور دوسری طرف خود مسلمان پبلک میں اپنے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کا احساس پیدا ہوا۔ غرض نواب صاحب کا یہ کارنامہ مسلمانوں کی پولٹیکل تاریخ میں ہمیشہ روشن اور ضیا بار رہے گا۔

اس احساس کا یہ نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ عالم وجود میں آئی اور اگرچہ نواب صاحب کو اس میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں، دو میں سے ایک تھے۔

سیاسیات ہندوستان کا ایک نازک اور اہم مسئلہ "ہندو مسلمانوں کا اتحاد" ہے اور ہندوستان کی حقیقی ترقی اور صحیح آزادی کا انحصار بھی اسی پر ہے۔

نواب صاحب کے بہت سے ممتاز ہندوؤں سے ذاتی اور خاندانی تعلقات تھے انھوں نے حیدرآباد میں کبھی ایسے خیال کو جس سے ہندو مسلم یا دیگر مذاہب کے

لوگوں کے ساتھ کوئی امتیاز پیدا ہو دل میں آنے ہی نہیں دیا۔ انگریز، پارسی، ہندو مسلمان اُن کے نزدیک یکساں تھے اور اُن کا افسرانہ فیض سب کے لئے مساوی تھا اسی باعث ہم ان اصحاب کی فہرست میں جنھوں نے نواب صاحب کی سرپرستی میں اعلیٰ مدارج حاصل کئے مختلف المذاہب اشخاص کو دیکھتے ہیں اُنھوں نے ایک تقریر میں بھی کہا تھا کہ :-

"میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ جس قدر میرے دوست میری قوم کے ہیں اس سے کچھ کم ہندو اور پارسیوں میں نہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہوگا کہ بعض ان میں ایسے ہیں جن کی عزت اور قدر میرے دل میں اپنے بھائیوں سے بڑھ کر ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی مجھے اپنا دوست سمجھتے اور میرے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔"

البتہ جب اُن کے شانوں پر اپنی قوم کی رہبری کا بار رکھا گیا تو ان کو ایسے مقاصد و خیالات سے جس کو وہ اپنی قوم کے لئے مضر و خطرناک اور تباہ کن تصور کرتے تھے محفوظ رکھنے کے لئے کانگریسی مطالبات اور کانگریس کی شرکت سے اجتناب کرنا پڑا تاہم ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا خیال اُن کے مطمح نظر رہا اور وہ ہمیشہ اتحاد کے لئے کوشاں و آرزومند رہے اور ہندوستان کی ہر گونہ ترقی کے لئے اس اتحاد کو ہی بنیاد سمجھتے تھے اس کا اندازہ نواب صاحب کی تقریروں سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے آنریبل مسٹر گوکھلے کی موجودگی میں علیگڑھ اور لکھنو میں کیں اور پھر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس مسئلہ پر مسلسل مضامین شائع کئے

اُنھوں نے مسٹر گوکھلے کی جامع صحت کی تقریر میں اپنے خیالات کو نہایت فصاحت اور صفائی کے ساتھ بیان کرکے ایک راستہ تبلایا تھا اور یہ وہ راستہ ہے کہ جب تک اس کو اختیار نہ کیا جائے گا کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اُنھوں نے کہا کہ مسلمان لیڈروں کو چاہئے کہ وہ اپنی قوم کو ان باتوں کے کرنے سے روکنے کی کوشش کریں جن میں اُن کا کوئی بڑا مذہبی یا قومی نقصان نہ ہو اور جن کے کرنے سے اُن کے ہم وطن ہندو بھائیوں کو رنج ہوتا ہو۔ اسی طرح ہندو لیڈروں پر لازم ہے کہ وہ اپنی قوم کو نصیحت کریں کہ جو کام ان کے لئے سخت نقصان پہنچانے والے نہ ہوں اور مسلمانوں کو اُس سے فائدہ ہو اُس میں مسلمانوں کی مدد کریں۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا خیال کریں اور ایک دوسرے سے کچھ کچھ اپنے فوائد کا نقصان گوارا کریں۔

آخر میں اُنھوں نے کہا تھا کہ "اگر ہندو بھائی مسلمانوں کی طرف دو انچ بڑھیں گے تو مسلمان دو گز بڑھ کر اُن کا خیر مقدم کریں گے"۔

اُنھوں نے کالج کے طلباء میں بھی ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی چنانچہ سر سید کی برسی کے موقع پر سر سید کی زندگی سے طلباء کو سبق حاصل کرنے کے متعلق جو تقریر کی اُس میں سر سید کے ہندو دوستوں کے ساتھ تعلقات محبت و الفت کا تذکرہ کرکے کہا کہ "آخر زمانہ میں البتہ ہندوؤں کو نیشنل کانگریس کے اختلاف سے سر سید سے کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی مگر جیسا کہ خود انھوں نے بارہا کہا کہ یہ اختلاف ایک خاص پولیٹیکل تحریک کی نسبت تھا نہ کہ عام۔ اور اس سے ان کے

مخلصانہ اور دوستانہ برتاؤ میں کبھی فرق نہیں ہوا۔ اگر انھوں نے پولیٹیکل ایجی ٹیشن کو ملک کے لئے عموماً اور اپنی قوم کے لئے خصوصاً مضر سمجھا اور علانیہ اس سے اختلاف کیا تو یہ ویسا ہی اختلاف سمجھا جا سکتا ہے جیسا کہ عقائد کا اختلاف جس کا اثر اصلی دوستی پر نہ تھا نہ ہوا تھا۔

تم کو چاہیئے کہ اتحاد کا سبق بھی ان سے سیکھو اور اپنے ہندو بھائیوں سے سچی دوستی اور خالص دوستانہ برتاؤ رکھو ملک کے لئے عموماً اور قوم کے لئے خصوصاً ایسا اختلاف نہایت مضر ہے۔ اس کو نفرت سے دیکھو اور جو کوئی اس اختلاف کو اچھا سمجھتا اور اس پر عمل کرتا ہو اس کو ملک کا اور خود اپنی قوم کا دشمن سمجھو۔"

اس تقریر میں باہمی نفاق و تعصبات کے پیدا ہونے کے وجوہ و اسباب وغیرہ بیان کر کے جو نصائح کئے اُن میں کہا کہ "میرے عزیزو تم ہرگز سرسید کے پیرو نہ سمجھے جاؤ گے نہ تم تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق ہو گے اگر تم نے اس زہریلے مادّے کو اپنے جسم میں سرایت کرنے دیا اور تم نے بھی ہندو مسلمانوں میں کچھ فرق سمجھا اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہو گا بلکہ تمہاری ساری قوم کو، اور نہ صرف تم بدنام ہو گے بلکہ یہ کالج بھی بدنام ہو گا۔ اور ہم پر اس کا الزام آئے گا..... ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو ان کے بزرگوں کو ادب اور عزت سے یاد کرو اُن کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ اور اُن کے ساتھ سچا دوستانہ برتاؤ رکھو"

(۱۰)

جب سے نواب صاحب نے کالج کی سکرٹری شپ کی ذمہ داری قبول کی تھی فکروں اور

پریشانیوں میں گھر گئے تھے۔ ابتدائے کار میں سید محمود کا اختلاف جس کی تہ میں بعض ٹرسٹیوں کی رقابت اور پارٹی اسپرٹ اپنا کام کر رہی تھی، نواب صاحب کے لئے سوہان روح تھا۔ سید محمود کے نام سے یا اُن کے اس اقتدار و اختیار سے جو بحیثیت پریسیڈنٹ ٹرسٹیاں حاصل تھا ہر ناجائز حملہ اخبارات اور رسالوں تک کے ذریعہ سے نواب صاحب پر کیا گیا اور بالآخر سر انٹونی میکڈانل کو اردو ہندی کے رزولیوشن کے سلسلہ میں موقع پیدا کر کے تو انتہائی مشکلات حائل کرادی گئیں۔ ان مشکلوں سے ہنوز نجات نہ ملی تھی کہ بہت سی اندرونی پیچیدگیاں جن کا سلسلہ بہت پہلے سے قائم ہو چکا تھا، سامنے آئیں۔

مُسلم یونیورسٹی کا جو تخیل قوم کے سامنے پیش کیا گیا اور جو گزشتہ سات سال میں ہر موقع پر زیرِ بحث رہا اس کا اقتضاء تھا کہ ہر حصۂ ملک سے جوق در جوق طلباء قومی کالج میں داخل ہوئے اور اس میں کامیابی ہوئی۔ مگر طلباء کی کثرت یورپین اسٹاف کے نقطۂ نظر سے کالج کی شہرت و نیک نامی کے لئے تردد کا باعث تھی اور وہ اس تعداد کو کم کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وسیع اختیارات کی خواہش اور اعلیٰ حکمراں طاقتوں کی طرف سے اس خواہش کی حوصلہ افزائی اور قومی غرور اندر ہی اندر بہت سی خرابیوں کا باعث ہو رہا تھا۔ کالج کی جماعت منتظمہ میں کچھ حصّہ ایسا تھا کہ اُس کو اس قومی امانت کے متعلق کچھ توجہ نہ تھی اور اپنے فرائض سے بالکل بے پروا تھا۔ کچھ ایسا حصّہ تھا کہ جو پارٹی فیلنگ میں مبتلا تھا اور بجائے امداد کے اس کی کارروائیوں سے ہر قسم کی تکلیفیں پہنچتیں، اخبارات میں نکتہ چینی کی جاتی اور طرح طرح کے دل شکن حملے کئے جاتے۔ البتّہ ایک بہت قلیل حصّہ ایسا

بھی تھا جو دل سوزی کے ساتھ کام کرتا مگر وہ اقلیت کے باعث بے اثر تھا۔

نواب صاحب نے ان حالات میں اسٹاف کی خواہشوں کی تکمیل اور اسٹاف کی رضا جوئی کو مناسب تصور کیا کیونکہ اُن کے نزدیک ان اہم نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے جو اسٹاف سے علانیہ مقابلہ کی صورت میں رونما ہوتے دفع الوقتی کی پالیسی اختیار کرنا ہی مناسب تھا اور انھوں نے " ہم لعل بدست آید وہم یار نہ رنجد" پیشِ نظر رکھ کر ایک ہیر پھیر کی پالیسی اختیار کی۔

تاہم ان حالات سے اکثر سخت بد دل اور پریشان ہو کر اس بارِ گراں کو اُتار پھینکنے پر آمادہ ہو جاتے ان تفکرات کا ان کی صحت پر جو پہلے ہی سے خراب تھی ہمیشہ بُرا اثر پڑتا۔ مگر قومی بہبودی وہ ترقی کی وہ لگن جو اُن کے دل میں تھی پھر اُن میں ہمت پیدا کرتی اور اُن کے قدر شناس اور شکر گزار رفیقانِ کار کی جانب سے اصرار پر اصرار ہوتا اور آخر الامر اپنی مخصوص سرگرمی و قابلیت کے ساتھ مصروف و منہمک رہتے۔

لیکن پیچیدگیوں اور مشکلات میں بجائے کمی ہونے کے اضافہ ہی ہوتا رہا طلباء اور اسٹاف کے تعلقات میں انتہائی خرابی آگئی۔ باہمی اعتماد و ہمدردی اور شفقت و ادب زائل ہوگیا اور اس کا نتیجہ طلباء کی ایک خطرناک اسٹرائک کی صورت میں نکلا۔

اگر معاملہ صرف اسٹرائک تک محدود رہتا تو بہت زیادہ خطرہ اور صدمہ نہ ہوتا لیکن نکتہ چینیوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ایک طرف نواب صاحب پر ملامت کی بوچھاڑیں کیں ان پر الزامات قایم ہوئے ان کا کریکٹر زیر بحث رہا اور دوسری طرف

اسٹاف نے اس اسٹرائک کو طلباء کے باغیانہ خیالات سے منسوب کیا۔

بہرحال اس واقعہ نے ان کو سخت صدمہ پہنچایا دل بیٹھ گیا اور طبیعت پر افسردگی چھا گئی لیکن اس کہن سال مدبّر نے اس موقع پر بھی اپنے بے نظیر تدبّر اور قابلیت کو نمایاں کیا طلباء کے بڑھتے ہوئے ہیجان کو اپنے دل کش اور مؤثر خطوط[۵۱] سے روکا ان کو نہایت شفقت اور ہمدردی کے ساتھ ان کی غلطیاں سمجھائیں اطاعت اور ادب پر مائل کیا اور آخرکار طلباء نے نواب صاحب کے سامنے اسی طرح معذرت اور ندامت کا اظہار کیا جس طرح سعادتمند فرزند کسی غیر مآل اندیشانہ کارروائی پر اپنے شفیق باپ کے سامنے معذرت و ندامت کرتے ہیں۔

پھر کمیشن تحقیقات قایم کرا کے کامل تحقیقات کے ساتھ اس بے بنیاد الزام کو جو جذبات بغاوت کی صورت میں لگایا گیا تھا رفع کیا اور اس کمیشن کے سامنے وہ تمام اسباب و علل وضاحت و صفائی کے ساتھ پیش ہو گئے جو کالج کی اندرونی خرابیوں اور اس نتیجہ کا باعث تھے۔ اور اس طرح آئندہ کے لئے ان کے انسداد کی تجاویز و تدابیر بروئے کار آ گئیں۔ اس تحقیقات نے ان نکتہ چینیوں الزاموں اور اعتراضوں کو بھی رفع کر دیا جس کے نشانہ کا رخ ہمیشہ نواب صاحب کی طرف رہتا تھا۔

بلاشبہ اس کمیشن کے ایک ممبر مرزا عابد علی بیگ صاحب نے جو نواب صاحب کے شدید ترین مخالف تھے اس اعتراض کو کہ "آنریری سکریٹری کے ہاتھ کی قوت کالج اسٹاف

۵۱۔ یہ خطوط مجموعہ مکاتیب میں شائع ہو چکے ہیں۔

کے اس رسوخ کے باعث جو اس کو گورنمنٹ میں حاصل ہے یا خود آنریری سکریٹری کی اس پالیسی کے لحاظ سے کہ وہ کالج اسٹاف کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا نہیں چاہتے اگر سلب نہیں تو نہایت کمزور ہو گئی۔" اپنی اختلافی رپورٹ میں تحریر کیا اور اس امر واقعہ سے انکار بھی نہیں ہو سکتا لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کالج کو جو شاندار اخلاقی و مادّی کامیابیاں حاصل ہوئیں اور اس کی عظمت و شہرت کو چار چاند لگے وہ بغیر اس پالیسی کے ممکن تھا؛ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر یورپین اسٹاف اپنے اس اقتدار کا زوال محسوس کرتا جو سر سید کے آخری زمانہ میں اس کو حاصل ہو گیا تھا اور سر انٹونی میکڈانل کی اس کوشش کا کہ "جہاں تک ممکن ہو یورپین اسٹاف کی قوت و اقتدار کو مضبوط اور وسیع کیا جائے۔" ردِ عمل دیکھتا تو یقیناً لفٹنٹ گورنر سے حکام ضلع اور ڈائرکٹروں سے انسپکٹروں تک ہمدردی زائل اور سلب ہو جاتی اور قوم میں اتنی آزادی اور اولوالعزمی اور فیاضی نہ تھی کہ وہ اس نقصان کی تلافی کر دیتی یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کالج کو جو کچھ مالی امدادیں حاصل ہوئیں اور امراء رؤسا اور تجار نے توجہ اور نظر التفات کی اس میں حکامِ صوبہ بلکہ حکامِ ضلع تک کی معاونت و عنایت شامل تھی۔

آج جب کہ آزادی خیال کا دَور دَورہ ہے مسلم یونیورسٹی قایم ہو چکی ہے تعلیم میں ترقی ہو رہی ہے تعلیمی ضرورتوں کا احساس ہے۔ برادرانِ وطن صدہا اسکول اور درجنوں کالج اور آزاد یونیورسٹیاں قایم کر رہے ہیں۔ ہر سال بلکہ ہر ماہ ان کی تعلیمی فیاضیوں کے چرچے اور تذکرے آویزۂ گوش ہوتے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی اپنی شان و شوکت کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے برد میں ہی اپنی قومی بیداری کا روشن ثبوت دے رہی ہے۔ مسلمان امراء مسلمان تجار اور

اہلِ دَوَل پر قومی تعلیم کی جانب سے افسوس ناک جمود طاری ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا کوئی شعبہ مکمل حالت میں نہیں، کروڑوں کی ضرورت ہے اور ہزاروں بھی نہیں ملتے اور اگر کبھی جوش میں آکر لاکھوں کے وعدے ہو جاتے ہیں تو سیکڑے بھی ادا نہیں ہوتے۔

پس اگر اس وقت جب کہ کالج مالی اور اخلاقی اعتبار سے تباہی کے کنارے پہنچ چکا تھا نواب محسن الملک نے وہ پالیسی اختیار کی جو ہدفِ ملامت بنائی گئی تو اس میں وہ معذور و مجبور تھے۔

(۱۱)

نواب صاحب کی عام صحت عرصہ سے خراب چلی آتی تھی۔ حیدر آباد کے زمانہ میں کئی دفعہ اُن کو اپنی زندگی سے مایوس ہونا پڑا۔ بعض اعضائے رئیسہ ماؤف ہو گئے۔ ایک پھیپھڑے کا پتہ ہی نہ تھا۔ اب کالج کی سکریٹری شپ اور قومی رہنمائی کے بار نے ان کی صحت کو اور بھی خراب کر دیا تھا۔ ذیابیطس کی شدّت بار بار ہوتی تھی جس کی برسوں سے شکایت تھی گزشتہ چند سال انتہائی انہماک اور محنت میں گزرے تھے اور اگرچہ اس کے شاندار نتائج نے ان کو آلام و افکار میں ان کو بہت کچھ تسلّی دے دی تھی لیکن اس اسٹرائک کے صدمہ نے ان پر ایک مایوسانہ عالم طاری کر دیا۔ تاہم قومی دُھن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ امراض کے شدید حملوں کے باعث وہ بمبئی چلے گئے جہاں ماہرانِ طب نے سختی کے ساتھ کام کی ممانعت کر دی تھی لیکن ان کی مصروفیت چلی ہی جاتی تھی۔ چند ماہ بعد بمبئی سے علی گڑھ اور اٹاوہ

ہوتے ہوئے شملہ گئے۔

اس زمانہ میں ایک بھائی کی موت اور دوسرے بھائی کی علالت سے ان کے آلام وافکار میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کی اس حالت مایوسانہ کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں۔

شملہ میں وہ توسیع اسکیم اور مسلمانوں کے مقاصد و مطالبات کے متعلق برابر کام کرتے رہے، ہز اکسلنسی ویسرائے سے اسی غرض کے لئے ملاقات کی اور متعدد اعلیٰ حکام سے ملے اور اہم قومی و سیاسی معاملات پر گفتگوئیں رہیں۔ مگر شمعِ حیات جھلملا رہی تھی۔ امراض پیہم حملہ آور ہو رہے تھے، سرخ بادہ کا دورہ ہوا، تمام چہرہ، سر اور گردن پر ورم آ گیا ہز اکسلنسی نے اپنی مہربانی سے اپنے خاص ڈاکٹر کو علاج کے لئے مامور کیا جنھوں نے نہایت توجہ سے علاج کیا۔ دو بار عمل جرّاحی کی نوبت آئی مگر افاقہ کی کوئی صورت نہ نکلی اور پیغام اجل آ ہی گیا۔ ہوش و حواس کی حالت میں ایک راسخ العقیدہ مومن اور خدا و رسول پر ایک کامل یقین رکھنے والے مسلمان کی حیثیت میں اُنھوں نے اپنے ملازموں اور دوستوں کو گواہ بنا کر کہا:۔

"مجھے اپنی زندگی کا اعتبار نہیں آپ سب گواہ رہیں کہ میں صدق دل سے کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھتا ہوں میں نے جو کچھ ملک و قوم کی خدمات کی ہیں وہ نیک نیتی کے ساتھ کی ہیں اور اگر ان میں کوئی غلطی واقع ہوئی ہو تو میں بے قصور ہوں کیونکہ میری سب کارروائیاں نیک نیتی پر مبنی تھیں۔"

اس کے بعد دو تین دن امراض کی مختلف کیفیتیں طاری رہیں ۱۵ اکتوبر کی رات کو بالکل غافل ہو گئے اور اُس زبان پر مہر سکوت لگ گئی جو فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتی تھی جو ایک موج سمندر کی طرح اپنی قوت کا کرشمہ دکھاتی تھی، کبھی گوہر بار ہوتی تھی اور کبھی گُل افشاں جس کے بس میں مجمع کو رُلانا اور ہنسانا تھا اور جس میں دوسروں سے بے اختیار اپنے حسب منشا کام کرا لینے کی طاقت تھی اور ۱۶ اکتوبر کی شام کو وہ شمع ہستی جس نے قوم کے دلوں کو تعلیم کی روشنی سے منور کیا تھا خاموش ہو گئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مر کر مہدی نے زندگانی پائی — جی کھو کے جزائے جانفشانی پائی

زندہ تھے تو چند روز مہماں تھے یہاں — جب مر گئے عمر جاودانی پائی

(حالی)

نواب صاحب کا انتقال ہوتے ہی شملہ سے یہ زہرہ گداز خبر ہندوستان میں شائع ہو گئی اور ٹرسٹیان کالج کو یہ بھی اطلاع دی گئی کہ نواب صاحب کی وصیت کے مطابق لاش اٹاوہ میں دفن کی جائے گی۔

ٹرسٹیوں نے فوراً ایک جلسہ کر کے متفقہ طور پر یہ رائے قرار دی کہ:-

"چونکہ نواب صاحب کے بے شمار احسانات مدرسۃ العلوم پر ہیں ان کے لحاظ سے مدرسۃ العلوم میں ان کا دفن کیا جانا مناسب ہے اور یہ گویا ان احسانات کا اعتراف ہے اور ان سے زیادہ سر سید کے پہلو میں دفن

ہوئے کا کس کو حق ہو سکتا ہے"

جب لاش علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو معتقد راعیانِ کالج اور طلبا وہاں موجود تھے۔ نواب وقار الملک بھی اس سانحہ کی خبر سنتے ہی پہنچ گئے۔ ردو قدح کے بعد جنازہ کی گاڑی ٹرین سے کاٹ لی گئی۔ نواب وقار الملک نے وصیت کی پوری تحقیقات کی اور جب یہ امر محقق ہو گیا کہ تدفین کے متعلق کوئی وصیت نہیں تو نواب وقار الملک نے گاڑی سے تابوت اُتارا اور وہ احاطۂ کالج میں لایا گیا۔ نماز جمعہ کے بعد مدرسۃ العلوم میں نماز جنازہ ادا ہوئی اور سر سید کے پہلو میں ان کے رفیق کو دفن کیا گیا۔

نواب صاحب کے فضائل و کمالات اور اخلاق و عادات اور ان کی پنجاہ سالہ قومی خدمات کا یہ قدرتی اقتضا تھا کہ ان کے انتقال کی خبر سے ہر جگہ اور ہر طبقہ میں رنج والم کے جذبات پیدا ہو جائیں مسلمانوں کو اپنے محسنِ قوم کی وفات سے اور ایسے وقت میں جب کہ سیاسی مستقبل کے لئے ان کی فراست و ذہانت اور قوتِ فکری کی سخت ضرورت تھی نہایت سخت صدمہ پہنچا۔ ہر گوشۂ ملک میں تعزیتی مجلسیں منعقد ہوئیں۔ ایصال ثواب کے لئے دعائیں مانگی گئیں اور رنج و غم کا اظہار کیا گیا مسلمان والیانِ ملک نے اس کو ایک قومی حادثہ سمجھا اور پُر درد الفاظ میں تعزیت کی۔ ہز اکسلنسی وسیرائے، اعلیٰ حکام صوبہ جات ہند، افسرانِ تعلیم اور دوسرے بڑے بڑے افسروں نے ٹرسٹیانِ کالج کو تعزیتی تار بھیجے اور اس حادثہ پر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ جس کو جتنی زیادہ گہری واقفیت تھی اُس نے اسی کے مطابق اس حادثہ کا اندازہ کیا۔ سر چارلس ڈنزل اٹیسن لفٹننٹ گورنر پنجاب نے اس حادثہ کو مسلمانوں کا اور گورنمنٹ کا

یکساں نقصان متصور کیا۔ لے لزلی گورنر بمبئی نے تمام ملتوں اور قوموں کے دانا دوست کی دائمی جدائی سے تعبیر کیا۔ غرض عرصہ تک ہنگامۂ ماتم و تعزیت بپا رہا۔

(۱۲)

نواب صاحب کی ذات میں بے شمار ایسی خصوصیات مجتمع تھیں جنھوں نے ان کو ذرہ سے آفتاب بنایا۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے اور قدیم طرز کے مکاتب میں چٹائی پر تعلیم پائی۔ انھوں نے ۱۰؍ روپیہ ماہانہ سے ملازمت شروع کی لیکن تین ہزار ماہوار تک ترقی کی۔ ایک بڑے ملک کے نظم و نسق کو درست کیا اور **مہدی علی** سے **"نواب محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ بہادر"** ہوئے۔ اس عظمت و شان کے ساتھ ان کے اخلاق کی رفعت بھی بہت اعلیٰ تھی۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ ہی فیاض نہ تھے بلکہ ہر غریب اور ہر کس و ناکس کی مصیبت پر اُن کا دل بھر آتا تھا وہ غریبوں میں مثل غریبوں کے بیٹھتے تھے اور گفتگو میں بھی وہی شان ہوتی تھی جب کبھی وطن آتے تھے تو ابتدا کے غریب ملنے والوں سے اُن کے برتاؤ میں کوئی رفعت نہ ہوئی بلکہ وہی ابتدا کی خصوصیت نظر آتی۔

ان کا دل محبت اور نیکی کا سرچشمہ تھا اور بعض اوقات وہ بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے اپنے مرتبہ کے خلاف بھی کر گزرتے تھے۔ ان کا تحمل بے نظیر تھا۔ وہ گالیوں کا جواب دعاؤں سے اور غصہ کا جواب عاجزی سے دیا کرتے تھے۔

ہر وہ شخص جو قومی کام میں ذرا بھی حصہ لیتا ان کا عزیز اور پیارا تھا۔ اس کے ساتھ ان کے برتاؤ میں شفقت نمایاں ہوتی اور اپنے پاس سے بھی ان کی مدد کرتے۔ وظیفہ کے بعد ان کی آمدنی محدود ہو گئی تھی تاہم ان کی فیاضی غیر محدود تھی اور وہ ایسی امداد کی وجہ سے اکثر اوقات مقروض ہو جاتے اور تکلیفیں اُٹھاتے۔

وہ قدیم تعلیم یافتہ تھے لیکن جدید تعلیم یافتہ گروہ انھیں کے اشاروں پر حرکت کر رہا تھا اور وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کے مسلّمہ لیڈر تھے۔ بقول مولانا شبلی مرحوم۔

"مرحوم ذاتی صفات کے لحاظ سے نادرۂ روزگار تھے۔ اس رتبہ پر ان کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ ادنے درجہ کے آدمیوں سے بھی باادب و عزت ملتے تھے۔ ملاقات میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے تھے۔ سب سے جھک کر ملتے تھے اس کے ساتھ نہایت فراخ حوصلہ سخی اور جواد تھے اور یہی اوصاف تھے جن کی وجہ سے انھوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی وہ مشاہیر کے ہم سر تھے۔ ان کا ایک خاص لٹریچر ہے جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ قوت تقریر میں بھی وہ نہایت ممتاز تھے۔

ظاہری صورت و شان سے بھی خدا نے ان کو کافی حصہ دیا تھا۔ اُن کے چہرے سے شان ٹپکتی تھی اور گو وہ سید تھے لیکن تاتاری استخواں کا دھوکا ہوتا تھا۔"

نواب صاحب کے اوصاف وفضائل کا کسی قدر اندازہ اس اپیل سے ہوتا ہے جو ان کی تمام عمر کے رفیق، ان کے کاموں کے محتسب نواب وقار الملک اور ان کے قوت بازو ان کے پرجوش اور روشن دماغ مددگار خان بہادر نواب سر مزمل اللہ خاں کے سی ایس آئی او بی ای سابق جائنٹ سکریٹری وحال وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے ان کی یادگار کے متعلق شائع کی تھی اور جس میں حسب ذیل ایک مختصر بیان اُن کی خدمات واوصاف کا تھا۔

"ان کے اوصاف حمیدہ اور ان کی خوبیاں دائرۂ تعریف سے باہر ہیں۔ ان کی موت مسلمانوں کے حق میں قومی مصیبت ہے۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کے ساتھ تعلق قایم ہونے سے پہلے بھی مرحوم ہمیشہ قومی کاموں میں حصہ لیتے تھے سرسید احمد خاں مرحوم کے جدید مذہبی فلسفہ نے جب تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عام اضطراب پیدا کر دیا تھا تو وہ مہدی علی ہی تھے جن کے پُرزور قلم نے اس آگ پر پانی ڈالا اور اس کو اس قدر ٹھنڈا کر دیا کہ لوگوں نے اس جدید فلسفہ پر غور کرنا شروع کیا جو عام دلچسپی "تہذیب الاخلاق" کو عامۂ خلایق میں حاصل ہوئی وہ زیادہ تر انھیں مضامین کی وجہ سے تھی جن کے آخر میں "مہدی علی" کا پیارا نام لکھا ہوتا تھا۔ علی گڑھ کالج کی جس وقت بنیاد رکھی گئی اور جب اس کا اسکول قایم ہوا تو وہ مہدی علی ہی

تھے جن کی حسنِ سعی سے نواب سر سالار جنگ مرحوم و مغفور نے اس کی ابتدائی مدد ریاست حیدرآباد سے نیز اپنی ذات خاص سے منظور فرمائی اور جب تک نواب محسن الملک حیدرآباد میں رہے آخیر وقت کالج کی ہر طرح مدد کرتے رہے اور جس وقت سے کہ انھوں نے حیدرآباد کو چھوڑا اُس وقت سے اپنے دمِ واپسیں تک بھی وہ اپنی تمام قوت اور توجہ کو کالج ہی میں صرف کرتے رہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی کالج کے نذر کردی

سر سید کے انتقال کے بعد قوم میں کالج کی طرف سے عام بے چینی پھیل گئی تھی مگر یہ انھیں کا کام تھا کہ انھوں نے اس بے چینی سے فائدہ اٹھایا اور کالج کو اس عروج پر پہنچایا جو اسے پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال قوم کے سامنے پیش کیا جس نے قوم کے مایوس دلوں کو زندہ کر دیا۔

کانفرنس کی جو خدمات مرحوم نے کیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ سر سید مرحوم خود آخری وقت میں اس سے مایوس ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک سال کانفرنس کا اجلاس بالکل نہیں ہوا۔ مگر یہ نواب صاحب ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ کانفرنس آل انڈیا کانفرنس

کہلائے جانے کی مستحق ہوئی۔

مرحوم کی خدمات جدید اسلامی فلسفہ کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دینے ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ اس کے علاوہ بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کا بھی شامل تھا جن کے جناب ممدوح قوم کی طرف سے خاص شکرگزاری کے مستحق ہیں خصوصاً ان کا سب سے آخری کارنامہ مسلمانوں کا وہ ڈپوٹیشن ہے جو تمام مسلمانان ہندوستان کی طرف سے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو بمقام شملہ حضور ویسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور جس نے بالآخر گورنمنٹ سے مسلمانوں کے ان حقوق کو تسلیم کرا لیا جو اب تک مبہم حالت میں چلے آرہے تھے اور زندگی کے آخر دنوں میں، گو کہ بظاہر جناب مرحوم کا سفر شملہ محض تفریحی سفر معلوم ہوتا تھا لیکن درحقیقت اس کو بہت بڑا تعلق گورنمنٹ آف انڈیا کی جدید ریفارم اسکیم کے اس حصہ سے تھا جو مسلمانوں سے متعلق ہے اور جس کو جناب مرحوم حتی الامکان مسلمانوں کے حق میں زیادہ ترمفید بنانے کے لئے بغیر کسی ظاہری نام و نمود کے کوشش کر رہے تھے۔ مگر ۱۶ اکتوبر کی شام نے ان سب امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ نہ حضور ویسرائے کے خاص ڈاکٹر کی ڈاکٹری کچھ کام آئی جن کو حضور ممدوح نے بغایت شفقت شاہانہ سے خاص طور پر نواب صاحب کے معالجہ کے واسطے مقرر فرمایا تھا۔ نہ غمخواروں کی غمخواری سے کوئی نتیجہ نکلا اور

آخر کار مرحوم نے ستر برس کے سن میں بعارضہ سرخ بادہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان تمام قومی خدمات کے ساتھ ان کا حسنِ اخلاق اور انکسارِ نفس اور بے نظیر تحمل اور بے مثال فروتنی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ بہت سے مواقع پر مرحوم کے دوست اور نیاز مند اس کو حد سے بڑھا ہوا پاکر معترض ہونے لگتے تھے مرحوم کی نہایت شاندار زندگی کے ساتھ ہی ان کی بے ریا سخاوت اور سیر چشمی کی حد بھی کسی کو کبھی معلوم نہ ہونے پائی۔ عامۂ خلائق میں ان کو اس قدر زیادہ ہر دلعزیزی کا منصب حاصل تھا جس سے مافوق کوئی توقع نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ جو خدمات کہ اُنھوں نے قوم اور ملک کی انجام دیں، گورنمنٹ نے بھی ان کو اسی اعتماد اور منزلت کی نگاہ سے دیکھا جس اعتماد اور منزلت کی وہ خدمات مستحق تھیں اور گورنمنٹ کی نگاہ میں جو وقار کہ جناب مرحوم نے حاصل کیا تھا اُس کا بہت بڑا ثبوت اب مل رہا ہے۔"

غرض سے

جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں — خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچہ میں — یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

(حالیؔ)

... زبیری مارہروی